کرشن چندر



میری یادوں کے چنار

میری یادوں کے چنار

کرشن چندر

مکتبہ اردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ ۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر . . . . سرفراز احمد
مطبع . . . . زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
قیمت . . . . -/۱۵ روپے

۱

وہ پونم کی صبح تھی۔ صبح اُٹھتے ہی ماں نے مجھے نہلایا۔ مجھے پہننے کے لئے ایک کوری سفید دھوتی دی۔ میرے کاندھے پر جنیؤ ڈالا۔ پھر بنگلے کے برآمدے کو خود اپنے ہاتھ سے دھو کر چمکایا۔ میرے لئے ایک چھوٹا سا غالیچہ بچھا دیا۔ اور خود مشرق کو سامنے کے پہاڑ کی گھاٹی سے بُلانے کے لیے چل دیں۔ گھر میں پانچ نوکر موجود تھے۔ مگر پونم کی صبح کو ماں میرا سب کام خود کرتی تھیں۔ کیونکہ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور پونم کا دن میرا دن ہوتا تھا۔ اُس دن کسی نوکر کو مجھے ہاتھ نہ لگانے دیا جاتا تھا۔

ایک گھنٹے تک میں نے گائتری کا جاپ کیا۔ اور برآمدے سے باہر سورج مکھی کے پھولوں کو گردن اُٹھائے مشرقی آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ آسمان پر کہیں پر رات کے تاروں کی راکھ باقی نہ تھی۔ آسمان کا فرش بالکل ہمارے بنگلے

کے برآمدے کے فرش کی طرح دُھلا دھلایا اور نیلا تھا۔ سُورج بھی اپنے برآمدے میں آیا نہ تھا۔ شاید اُس کی ماں اُسے نہلا رہی ہوگی۔ میرا خیال ہے سورج روز نہاتا ہوگا۔ جبھی تو اس کا چہرہ ہر روز اس قدر صاف اور روشن ہوتا ہے میرا خیال ہے سُورج کی ماں بھی میری ماں کی طرح سخت دل ہوگی، جو ہر روز اپنے بیٹے کو نہانے پر مجبور کرتی ہے۔ اب کبھی کبھی نہانا تو مجھے اچھا لگتا ہے۔ خاص طور پر گھاٹی کے نیچے بہنے والی ندی پر نہانا جہاں سے پن چکی کا پانی ایک آبشار کی طرح ندی میں آ بلتا ہے۔ اور نیلے پانی میں لاکھوں بُلبلے چھوٹتے چھوٹتے اور جسم میں گُدگُدی کرتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے تاراں میرے جسم میں گدگدی کرتی ہے۔

آپ تاراں کو نہیں جانتے ہیں نا! تاراں مُولو چمار کی لڑکی ہے۔ جو ہمارے بنگلے کے نیچے کی گھاٹی پر ایک چھوٹے سے جھونپڑے میں رہتا ہے تاراں بہت غریب ہے۔ اُس کا جھگّا جگہ جگہ سے پھٹا رہتا ہے۔ اور اُس کی شلوار میں بھی چیتھڑے لگے رہتے ہیں۔ اور اُس کے بالوں میں اُس کی ماں کبھی تیل نہیں ڈالتی۔ وہ لوگ تیل سر لگانے کے لیے نہیں بلکہ کھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میری ماں اُن لوگوں سے بڑی نفرت کرتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ غریب ہیں اور نیچ ذات کے ہیں۔ مجھے بھی تاراں کے ماں باپ بالکل پسند نہیں ہیں بڑے سُوکھے سانولے مریل سے نظر آتے ہیں جیسے ہر وقت بھُوکے رہتے ہوں۔ میری ماں اُن لوگوں کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ مگر وہ دونوں ہر روز آ کر کچھ نہ کچھ مانگتے رہتے ہیں۔ کیونکہ مولو چمار کے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ اور وہ صرف جُوتے بناتا ہے۔

لیکن تاراں مجھے پسند ہے۔ اُس کا چہرہ بالکل گول ہے۔ چاند کی طرح اور جب وہ اپنے چھوٹے لب کھول کر ہنستی ہے تو مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں بڑا ہو کر تاراں سے شادی کر لوں گا۔ مگر ابھی اس میں بہت عرصہ باقی ہے۔ کیونکہ میری عمر آٹھ سال کی ہے۔ اور تاراں صرف چھ سال کی ہے۔ اور ہم لوگوں کو اپنے ماں باپ کی طرح بڑا ہونے میں بہت سال لگ جائیں گے۔ نہ جانے یہ بڑی عمر کے لوگ، ہم چھوٹے بچوں کو شادی کیوں نہیں کرنے دیتے۔ میری ماں تو مجھے تاراں سے کھیلنے بھی نہیں دیتیں۔ ہم دونوں چھُپ کے کھیلتے ہیں۔ اور تاراں کھیلتے کھیلتے جب مجھ سے خفا ہو جاتی ہے۔ تو مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ دراصل وہ دو شادیاں کرنا چاہتی ہے۔ چند ماہ ہوئے راجہ صاحب کا مہاوت ہاتھی پر سوار ہو کر ہمارے بنگلے کے سامنے سے گذرا تھا۔ جب سے تاراں نے طے کر لیا ہے، کہ وہ پہلی شادی تو اُس مہاوت سے کرے گی۔ اور دوسری مجھ سے۔ جب میں اُس سے کہتا ہوں۔ کہ تُو دو شادیاں نہیں کر سکتی تو وہ میرا مُنہ چڑاتے ہوئے کہتی ہے۔ کیوں نہیں کر سکتی۔ اگر منشی گنگارام دو شادیاں کر سکتا ہے۔ تو میں کیوں نہیں کر سکتی؟ —— اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اور جب تاراں کی کسی بات کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہوتا ہے۔ تو میں اُسے پیٹتا ہوں۔ جب بھی وہ دوسری شادی کی بات کرتی ہے۔ میں اُسے پیٹتا ہوں!

"ارے میں تو تم کو گاتیری منتر پانسو بار پڑھنے کے لیے کہہ گئی تھی۔ یہ تم چُپ چاپ غالیچے پر بیٹھے سورج مکھی کے پھُولوں کو کیا گھُور رہے ہو؟"

ماں کی آواز سُن کر میں گھبرا گیا۔ اور جلدی جلدی بآوازِ بلند گایتری منتر کا جاپ کرنے لگا۔ ماں نے اپنے غصّے کو دبلتے ہوئے مشیر جی سے کہا: "عجیب بچّہ ہے۔ نہ جانے ہر وقت کن خیالوں میں کھویا رہتا ہے؟"

مشیر گنگا رام بولے: "اسی لیے میرا سِدھ کیا ہُوا کوئی منتر اس پر نہیں چلتا۔ یہ منتر یاد ہی نہیں کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

میری ماں نے مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔ مگر مشیر جی نے فوراً یہ کہتے ہوئے روک دیا۔

"ناں! ناں! اس شبھ گھڑی میں بچے کو مارنا ٹھیک نہیں ہے!"

میری ماں بڑبڑاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ مشیر جی نے پوچھا: "ست ناجا تیار ہے؟"

پونم کے روز مجھے ست ناجے میں تولا جاتا ہے۔ جتنا میرا وزن ہوتا ہے۔ اتنے وزن کے سات اناج میری ماں لے کر اُنھیں ملا دیتی ہیں۔ ماش، چنے چاول، گیہوں، تِل، مکّا اور جوار سے کر ست ناجا بناتی ہیں۔ پھر مجھے برآمدے کے باہر باغیچے میں بتنگ کے پیڑ سے لگے ہوئے لکڑیاں تولنے والے بڑے ترازو کے ایک پلڑے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے پلڑے میں ست ناجا ڈالا جاتا ہے اور جب دونوں پلڑوں کا وزن برابر ہو جاتا ہے۔ تو مجھے پلڑے سے نکال لیا جاتا ہے۔ اور ست ناجا مشیر جی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جو اس دوران میں برابر کوئی منتر پڑھتے رہتے ہیں۔ یہ آٹھ سال سے ہو رہا ہے۔ اور اس لیے ہو رہا ہے کیونکہ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اور صرف آٹھ سال کا ہوں۔ اور بہت دُبلا ہوں۔ ماں جی مجھے بہت کھلاتی پلاتی رہتی ہیں۔ لیکن پتا جی کے خیال میں وہ

مجھے جتنا کھلاتی پلاتی ہیں۔ اُتنا ہی میں دُبلا ہوتا جاتا ہوں! میرے پتاجی کا خیال ہے کہ اگر میری ماں میری صحت کی اس قدر دیکھ بھال نہ کریں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ تو میں بہت جلد موٹا اور تگڑا ہو سکتا ہوں۔ مگر میری ماں تو یہ سُنتے ہی خفا ہوجاتی ہے۔ اور میرے پتا سے کہتی ہے: "تم تو سنگدل ہو۔ تمھیں اپنے بچے سے ذرا بھی محبت نہیں ہے!"

مجھے اپنے پتاجی بہت پسند ہیں۔ کیونکہ وہ کبھی کبھی میرے ساتھ کھیلتے ہیں۔ لیکن میری ماں میرے ساتھ کبھی نہیں کھیلتی ہیں۔ ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہیں، اور کھلاتی رہتی ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہے۔ اب مجھے کھانے سے کس قدر نفرت ہوگئی ہے۔ میں دوسرے بچوں کی طرح رہنا چاہتا ہوں۔ جنھیں دن میں صرف ایک بار کھانا ملتا ہے۔ جنھیں کبھی ناشتہ نہیں ملتا۔ جنھیں پھل صرف وہی ملتے ہیں جو میں اپنے باغ سے چرا کر اُنھیں دیتا ہوں۔ جنھوں نے آج تک کبھی ایک انڈا نہیں کھایا۔ مجھے ہر روز کھانا پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ دوسرے لڑکے مجھ سے بہت تگڑے ہیں۔ اور میں بہت کمزور ہوں۔ میں اُن لوگوں سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہوں۔ مگر کشتی اور مُکے بازی اور پنجہ لڑاتے میں وہ دوسرے لڑکے مجھ سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔

جب مشرجی مجھے لکڑیوں والے ترازو میں تول کر ست ناجا سمیٹ چکے تو میری ماں نے مجھے دوسرے کپڑے لا کے دیئے۔ گہری نیلی نیکر اور آسمانی رنگ کی قمیص۔ نیکر کارڈورائے مخمل کی تھی۔ اور قمیص کی نیلی سطح بالکل آسمان کی سطح کی طرح پھسلنے والی معلوم ہوتی تھی۔ ماں نے مشرجی کو میری سفید کوری دھوتی دے دی۔ جو انھوں نے کل ہی بازار سے منگوائی تھی۔ پھر اُنھوں نے مشرجی کو دو روپے دیئے۔

مشر جی نے انھیں اور مجھے آشیرواد دی۔ اور سامان لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور جب وہ برآمدے کے جنگلے سے نکل کر باہر کی پگڈنڈی پر ہولیے تو میرے پتا جی اپنے کمرے سے باہر نکل کر پوچھنے لگے!

"مشر جی کا فراڈ پورا ہو گیا؟"

"ہاں ہو گیا!" میری ماں تنک کر بولیں۔

"اب اس کے بعد کیا گوردوارے جاؤ گی؟"

"ہاں! ہاں! جاؤں گی، ضرور جاؤں گی۔ اور کیوں نہ جاؤں۔ تمھیں تو اپنے بچے کی صحت کی فکر ہے نہیں! دیکھو تو! جانے کس خوفناک بیماری سے میرا لال دن پر دن دُبلا ہوتا جا رہا ہے!"

میرے پتا جی نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا مجھے آنکھ ماری پھر مسکرا کر بولے۔ "بھاگوان۔ تیرے بیٹے کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ ہم دونوں کا اکلوتا بیٹا ہے! ——— میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے۔ کہ ہم ایک بچہ اور پیدا کریں۔ . . . ."

"شبھ شبھ بولو۔ ہائیں! ہائیں! کیا باتیں کرتے ہو۔ اس چھوٹے بچے کے سامنے تمھیں شرم نہیں آتی؟" میری ماں کچھ خفا ہو کے کچھ خوش ہو کے کچھ گھبرا کر کچھ لجا کر بولیں۔

"میں تو گوردوارے جاتی ہوں! تمھیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ کیوں نہ ہو، آریہ سماجی ٹھہرے۔ تمھارا تو کوئی دھرم ہی نہیں ہے!"

میری ماں سناتن دھرم کی پجاری تھیں۔ باپ آریہ سماجی تھے۔ دونوں میں

اکثر نوک جھونک رہتی۔ کبھی کبھی اس بحث میں وہ مجھے بھی شامل کر لیتے۔ جب پتا جی مجھ سے بہت لاڈ پیار کرتے، تو آخر میں ضرور پوچھتے! اور میری ماں کو چڑا چڑا کر پوچھتے۔

"میرا بیٹا آریہ سماجی ہے نا؟"

اور میں اُن کی گود میں مچل کر کہتا ـــــــ "ہاں میں آریہ سماجی ہوں!"

پھر کبھی میری ماں مجھ سے لاڈ پیار کرتیں۔ اور وہ مجھے اپنی آغوش میں لے کر میرا مُنہ چُومتیں اور پتا جی کو دکھاتے ہوئے مجھ سے کہتیں ـــــــ "نہیں میرا بیٹا تو سناتنی ہے۔ کیوں بیٹے۔ تم سناتنی ہو نا؟"

"ہاں، ماں۔ میں سناتنی ہوں۔ میں بھی بڑے لاڈ سے اُن کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہتا ـــــــ میں تو اپنی ماں کا سناتنی بیٹا ہوں!"

ایسے موقع پر میری ماں زبان نکال کر میرے پتا کو چڑاتیں۔ اور وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑتے۔ اور میں اس کھیل سے بہت محظوظ ہوتا!

گوردوارے جانے کے لیے دو راستے تھے۔ ایک راستہ تو بازار سے ہو کر گزرتا تھا۔ دوسرا راستہ ہمارے بنگلے کے عقب کے باغ سے ہو کر جاتا تھا۔ ہم دونوں نے باغ والا راستہ اختیار کیا۔ یہ اگست کا خوب صورت دن تھا۔ ہمارے باغ میں سیب سُرخ ہو چلے تھے۔ اور ناشپاتیوں کا رنگ تاراں کے چہرے کی طرح سنہری ہو چلا تھا۔ اور اُن کی جلد بھی اُسی طرح ملائم اور شفاف دکھائی دیتی تھی۔ چنار کے پتوں کو جیسے آگ نے چھو لیا تھا۔ ستمبر میں یہ چنار کے پتے بالکل شعلوں کی طرح بھڑک جائیں گے۔ اور کھڑکھڑا کر نیچے گر پڑیں گے۔ پھر میں اور تاراں

ان پتوں میں کھیلیں گے - ہم لوگ ان سنہرے پتوں کے تاج بنائیں گے - اور ایک دوسرے کو پہنائیں گے - تین چار پتوں کو ملا کر انھیں ندی کے کنارے اُگنے والے سرکنڈوں کی تیلیوں سے جوڑ کر کشتیاں بنائیں گے اور انھیں ندی میں چھوڑ دیں گے - چنار کے سنہرے پتوں والی کشتیاں جب ندی کی سطح پر تیرتی ہیں - تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے - گویا راجہ جی کے محل کے تالاب میں کنول کے پھول کھلے ہیں -

یہ پونم کی صبح واقعی بڑی خوب صورت تھی - اور یہ پورا دن میرا دن ہوتا تھا - اور مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا تھا - میری ماں بڑے سنبھل سنبھل کر بڑے پُر وقار انداز میں چل رہی تھیں - اور میں اُن کے ارد گرد چکر کھاتا ہوا بھاگتا کبھی بھاگ کر آگے بڑھ جاتا، کبھی رک کر اُن کی راہ دیکھنے لگتا - کبھی پیچھے رہ کر تتلیاں پکڑنے میں مصروف ہو جاتا - اور وہ چلا کر مجھے کبھی آگے بڑھ جانے پر کبھی پیچھے رہ جانے پر سرزنش کرتیں - واقعی بچوں کے لئے بڑی مصیبت ہے - انھیں کبھی یہ معلوم نہیں ہو سکتا - کہ بڑے کیا چاہتے ہیں - پیچھے رہ جاؤ تو گالی کھاؤ - آگے بڑھ جاؤ تو گالی کھاؤ - ساتھ چلو تو کہتے ہیں - کیوں میرے ساتھ چپک کر چل رہے ہو - آگے بڑھو - کچھ سمجھ میں نہیں آتا - کہ یہ بڑے کیا چاہتے ہیں!

مجھے پونم کی صبح میں گوردوارے جانا بہت پسند ہے - وہاں لوگ ڈھولک اور باجے پر گیت گاتے ہیں - جو مندر میں نہیں گاتے ہیں - وہاں پر ایک سفید ریش بڈھا ایک بڑی خوب صورت سی کتاب کھولے کچھ پڑھتا رہتا ہے -

اور بار بار چنور ہلاتا رہتا ہے۔ اور جو وہ پڑھتا ہے، وہ بڑا ہی میٹھا اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں اُس کا مطلب تو نہیں جانتا۔ مگر وہ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔ پھر سب لوگ کھڑے ہو کر ارداس کرتے ہیں۔ اور ارداس کے بعد میری آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتی ہیں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے ارداس کے بعد حلوا ملے گا۔ پیتل کی ایک بڑی پرات میں اُس کے اوپر ایک سفید ململ کا کپڑا اوڑھائے ایک آدمی آگے بڑھتا ہے۔ اور میں اپنی دونوں ہتھیلیاں جوڑ کر اس کے آگے کر دیتا ہوں اور وہ میری دونوں ہتھیلیوں کو گرم گرم حلوے سے بھر دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو حلوا اس قدر گرم ہوتا ہے۔ کہ میں اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اُس حلوے کو اُوپر تلے کرتا رہتا ہوں۔ مگر کبھی نیچے نہیں گراتا۔ حلوا میٹھا اور نرم اور چمکتا ہوا ملتا ہے۔ اور میں اپنی ماں سے کہتا ہوں کہ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو ضرور گوردوارے کا گرنتھی بنوں گا۔ اور میری ماں افسوس سے سر ہلا کر کہتی ہے۔ "تو نہیں بن سکتا، میرے بچے۔ کیونکہ تو ہماری اکلوتی اولاد ہے۔ اگر تیرا کوئی دوسرا بھائی ہوتا۔ تو ہم تیرے کیس رکھا دیتے۔ اُس زمانے میں یعنی میرے بچپن کے زمانے میں یہ دستور تھا۔ کہ اکثر ہندو گھروں میں بڑے لڑکے کو کیش دھاری بنا دیا جاتا تھا۔

گوردوارے سے باہر نکل کر چند قدم کے فاصلے پر پیپل کا ایک بہت بڑا پیڑ تھا۔ اس پیڑ کے ارد گرد ایک پختہ چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اور اس چبوترے پر تلسی کے گملوں کے درمیان پتھر کی کئی شکستہ مُورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ بڑی خوب صورت مُورتیاں تھیں۔ ایک مُورتی تو بالکل میری ماں جی کے چہرے

کی طرح سُندر تھی۔ ایک اور مُورتی تھی، جو ناچ رہی تھی۔ لیکن اُس کی پتھر کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ اس مورتی کے چار ہاتھ تھے۔ ایک مورتی تھی اُس کا سر نہیں تھا۔ صرف جسم تھا۔ اور ایک جوان عورت کا جسم تھا۔ اور وہ جسم ایسا ہی خوبصورت تھا۔ جیسا اُن لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ جو صبح سویرے ہمارے بنگلے کے سامنے کی پگڈنڈی پر اپنے سر پر گھڑے اُٹھائے ہوئے پانی کے چشمے کی طرف جاتی ہیں۔

بہت سی مُورتیوں پر سیندور لگا ہُوا تھا۔ اور چبوترے کے قریب دو بانسوں کو گاڑ کر کسی نے لکڑی اور گھاس پھوس کا ایک چھجا سا بنا دیا تھا۔ اور اس چھجے سے ایک گھنٹہ لٹک رہا تھا۔ ماں نے تُلسی کے پتّے توڑ کر مُورتیوں کے آگے رکھے اور ہاتھ جوڑ دیئے۔ اور مجھ سے بھی ہاتھ جوڑنے کو کہا۔ اور آنکھیں بند کر کے پرارتھنا کرنے کو کہا۔ مگر میں آنکھیں کھولے اُن خوبصورت مورتیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر جب میری ماں چھجے کا گھنٹہ بجانے لگیں تو میرا جی بھی گھنٹہ بجانے کو مچل گیا۔ اور میں نے ماں سے کہا ——— "ماں۔ میرا جی پجاری بننے کو چاہتا ہے۔ یہاں پر پھر تو مجھے روز گھنٹہ بجانے کو ملے گا!"

"ارے پگلے" میری ماں نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔ "تو پجاری نہیں بن سکتا!"

"کیوں نہیں بن سکتا؟"

"تو کشتری ہے۔ براہمن نہیں ہے! اور صرف براہمن ہی پجاری بن سکتے ہیں!"

"کشتری لوگ کیوں گھنٹہ نہیں بجا سکتے؟" یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔
آخر میں نے سوچ سوچ کر ماں سے کہا۔
"تو میں بڑا ہو کر براہمن بن جاؤں گا"
"تُو تو بڑا احمق ہے!" میری ماں زور سے ہنسیں۔
"بھلا کشتری بھی کبھی براہمن ہو سکتے ہیں؟ ناممکن ہے۔"
"کیوں ناممکن ہے؟ —— یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں۔ تو کشتری براہمن کیوں نہیں ہو سکتے؟"

مگر ماں سے کچھ پُوچھنا بے کار تھا۔ ہم بچے کتنے سوال ہر روز کرتے ہیں، اور کتنے سوالوں کے جواب ہمیں نہیں ملتے ہیں۔ بڑے تو دیوتاؤں کی طرح ہیں۔ جی چاہے تو جواب دے دیں۔ نہ جی چاہے تو غصّے سے مار بیٹھیں اس دُنیا میں بچوّں کے لئے بڑی مصیبت ہے!

پیپل کے پیڑ سے آگے چل کر میری ماں مجھے ایک چوڑی پگڈنڈی پر لے گئیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اب ہمیں کہاں جانا ہے۔ اس لیے میں خوشی سے لہرا کر پگ ڈنڈی پر دوڑنے لگا۔ کیونکہ یہ پگ ڈنڈی ہمارے قصبے سے باہر جاتی تھی۔ یہ ایک لمبی بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی تھی۔ اس پگڈنڈی کے راستے میں دھان کے کھیت آتے تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے جنگل مرغزار آتے تھے۔ اور اُونچے نیچے ٹیلے آتے تھے۔ اور لکڑی کے دو پُل آتے تھے۔ جن کے نیچے شور مچاتے ہوئے خطرناک نالے بہتے تھے۔ اور جن کے دونوں طرف چیل کے چھتنارے پھیلائے ہوئے درخت کھڑے تھے۔ جن میں سے جب ہوا چلتی تھی

تو درخت اس طرح سے شائیں شائیں کرتے جیسے دُور کہیں بارش ہو رہی ہو!

یہ راستہ مجھے سب سے زیادہ پسند تھا۔ اس لیے میں اپنی ماں کے منع کرنے پر بھی چھلانگیں لگاتا ہُوا آگے دوڑتا گیا۔ پہلے ٹیلے کی اوٹ میں بہت سی بھیڑیں ایک انجیر کے درخت کے نیچے جمع تھیں۔ اور انجیر کی ایک بڑی ڈال جُھکائے ہوئے ایک چرواہا اُس پر سوار تھا۔ اور بھُورے بھُورے انجیر توڑ کر اپنی چرواہی کے مُنہ میں دیتا جاتا تھا۔ اور وہ دونوں خوشی سے ہنس رہے تھے۔ اور اُنھیں دیکھ کر میں نے سوچا۔ کہ آج میں بھی تاراں کو اسی طرح ناشپاتی کھلاؤں گا!

اس خیال سے خوش ہو کر میں آگے دوڑتا ہُوا چلا گیا۔ سامنے سے ایک خرگوش نے اپنے لمبے لمبے کان اُٹھا کر مجھے دیکھا اور دُور جنگل میں بھاگتا چلا گیا۔ دو گلہریاں ناچتی ہوئی چکری کے سپید تنے والے پیڑ پر چڑھ گئیں۔ میں بھی اُنھیں پکڑنے کے لئے چکری کے پیڑ پر چڑھ گیا۔ مگر وہ دونوں مجھ سے زیادہ دُبلی اور تیز طرار تھیں۔ میرے قابو میں نہیں آئیں۔ اُونچی پھننگ پر بیٹھ کر اپنی خوب صورت دُم کو اپنے مُنہ میں دبائے شریر نگاہوں سے میری طرف تاکتی رہیں۔ میرا جی چاہا کاش میں بھی ایک گلہری ہوتا۔ اور آزاد اور بے فکر ہو کر جنگلوں میں گھومتا۔ اور اخروٹ کے پیڑوں پر چڑھ کر اخروٹ کُتر کُتر کر کھاتا۔ لیکن میرے تو ماں باپ ہیں۔ اور ایک بنگلہ ہے۔ جہاں پانچ نوکر ہیں۔ اور وہ سب لوگ میری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتے ہیں! آدمی کا بچہ ہونا واقعی بڑی

مصیبت ہے!

میری ماں نے آکر مجھے چکری کے پیڑ سے نیچے اُتارا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اور اُس کا چہرہ سُرخ تھا اور بہت دیر تک مجھے میری بُری عادتوں پر کوستی رہی۔ لیکن یہ تو بڑے لوگوں کا قاعدہ ہی ہے۔ ان لوگوں کے سانس چلنے سے بہت جلد پھُول جاتے ہیں۔ اور یہ لوگ بہت جلد غصّے میں آجاتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو گلہریوں، خرگوشوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ ہمیشہ تیوری چڑھائے ہوئے کسی گہری فکر میں غلطاں نظر آتے ہیں۔ اکثر راتوں میں مَیں نے اپنی ماں کو اپنے پتا جی سے کہتے ہوئے سُنا ہے۔ اب لڑکا بڑا ہو گیا ہے۔ اب ہمیں کچھ بچت کرنا چاہیے۔ میں نے کسی گلہری یا خرگوش کو آج تک بچت کرتے ہوئے نہیں دیکھا!

چکری کے پیڑ سے اُتر کر میں پھر اپنی ماں کے آگے آگے چلنے لگا۔ موڑ کاٹ کر یکایک ہم ایک اُونچے ٹیلے کی جانب بڑھ گئے۔ جس کے اوپر بیریوں کے گھنے جھاڑ تھے۔ اور جس کی شاخوں سے میلے کچیلے کپڑوں کی سینکڑوں چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ پیر شاہ مُراد کا مزار تھا۔ جس کے مجاور چاچا رمضانی تھے۔ چاچا رمضانی کا بیٹا جمّا میرا بڑا دوست تھا۔ وہ ہر پُونم کے دن میری راہ دیکھتا تھا۔ اور جب میری ماں مزار پر نذر نیاز چڑھاتیں۔ میں اور جمّا بیریوں کے جھاڑ کے گرد لکن میٹی کھیلتے اور سُرخ سُرخ بیر خشک پتوں سے ڈھونڈ کر کھاتے۔ اور بیریوں کے ہرے ہرے پتوں کے گچھوں کے اندر بیٹھی ہوئی بلبل بولتی تھی۔ اور گٹاریاں چیختی تھیں۔ اور مینائیں گیت گاتی

تھیں ۔ اور سفید کلغی والی چمپئی چڑیا کُو ہُوکُوک اکُو ہُوکُوک ! کی صدا لگاتی تھی ۔

مجھے پیر مراد شاہ کا مزار بہت پسند تھا ۔ اور حجرے کے ساتھ کھیلنا بھی بہت پسند تھا ۔ اور چاچا رمضانی بھی مجھے بہت اچھے لگتے تھے ۔ اس لیے جب ہم لوگ مزار سے نیچے اُتر آئے تو میں نے خوش ہو کر اپنی ماں سے کہا
ماں ۔ میں نے طے کیا ہے کہ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو مسلمان بنوں گا ۔

میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا ۔ کہ میں نے کونسی ایسی بُری بات کہدی جسے سُن کر میری ماں اکدم بھڑک گئیں ۔ اور اُنھوں نے وہیں پر میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر میری گال پر زور سے ایک طمانچہ لگا دیا ۔ طمانچہ اتنے زور کا تھا کہ میں درد سے رونے لگا ۔ اور واپسی میں سارے راستے روتا رہا ۔ اور چکوری کی گلہری نے مجھے روتے ہوئے دیکھا ۔ خرگوش نے مجھے روتے ہوئے دیکھا ۔ انجیر کھاتے ہوئے چرواہے اور چرواہی نے مجھے روتے ہوئے دیکھا ۔ اور میری ماں نے مجھے کئی بار چپ کرانا چاہا ۔ لیکن میں بھی ڈھیٹ بن کر روتا ہی رہا ۔ تاکہ ساری دُنیا دیکھے کہ میں روتا رہا ہوں ۔ میری ماں نے مجھے مارا ہے اور میں رو رہا ہوں ۔ میں رو رہا ہوں اور میں گلہری بن گیا ہوں اور میری ماں مجھے چاروں طرف ڈھونڈھ رہی ہے ۔ میں خرگوش بن کر چھپ گیا ہوں اور میری ماں پاگلوں کی طرح جنگل جنگل گھوم رہی ہے ۔ میں بیریوں کے جھنڈ میں بُلبل بن گیا ہوں اور میری ماں مایوس ہو کر مزار کے چکر لگا رہی ہے ۔ اپنی ماں کی حالتِ زار دیکھ کر میرے دل میں اُس کے لئے ترس آگیا اور میں اور بھی زور زور سے رونے لگا ! اور اُس وقت تک روتا رہا جب تلک واپس بنگلے میں

پہنچ کر میرے پتا جی نے مجھے پیار نہیں کر لیا۔ اور مجھے باغ میں کھیلنے کے لئے چھٹی نہیں دے دی!

اور میں چاہتا بھی یہ تھا۔ ایک لمحے میں میرے آنسو خشک ہو گئے۔ اور میں دوڑتا ہُوا اپنے وسیع باغ کے اُس کونے میں چلا گیا۔ جہاں لوہے کی بڑی بڑی محراب دار جالیوں پر انگور کی بیلیں لدی تھیں۔ اور اُن کے چاروں طرف لکڑی کے جنگلے پر بوگن ویلیا کے سُرخ اور شربتی پھول چمک رہے تھے۔ لوہے کی ان محراب دار جالیوں میں چھپتی ہوئی تاراں یہیں کہیں پر میرا انتظار کر رہی تھی اور میں اُسے آواز دیتا ہُوا اُسے ڈھونڈتا اِدھر اُدھر بھاگتا رہا۔ آخر وہ ایک محراب کے اُوپر چڑھی انگور کے بیلوں میں چھپی اودے اودے انگور کھاتی ہوئی مجھے مل گئی۔ اور میں نے اُسے ٹانگ سے پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیا، اور اُسے نیچے گرا لیا۔ اور اُس کا مُنہ کھول کر اُس میں انگور کے دانے ڈالنے لگا۔

تاراں بولی "یہ کیا کر رہے ہو تم؟ ہٹو!"

میں پرے ہٹ گیا۔ اور اُس سے کہا "وہ چرواہا اور چرواہی اسی طرح ایک دوسرے کے مُنہ میں انجیر رکھ کر کھاتے تھے۔"

"تو ایک دوسرے کی گردن پر چڑھ کر تھوڑے ہی کھلاتے ہیں۔ پگلے؟"

"اچھا۔ تو میں تم کو کھلاتا ہوں۔ تم مجھ کو کھلاؤ!"

"نہیں پہلے تم کھلاؤ!" تاراں بولی۔

"نہیں۔ پہلے تم!" میں نے ضد کی۔

"اچھا اکڑ دُکڑ کر لیتے ہیں۔" تاراں بولی۔ اور یہ کہتے ہی وہ ایک انگلی

سے میرے سینے سے اپنے سینے کو چھُوتے ہوئے بولی "اِکڑ ڈُکڑ بمبّا بھو۔ اسّی نوّے پُورا ڈھارا سو! ——— تمُ! ——— آہا جی۔ تم ہمیں انگور کھلاؤ گے!"

میں نے اُوپر محراب دار جالیوں کی بلندیوں کو دیکھا۔ اور پھر سب سے اچھے انگور کا ایک گچھا توڑ لیا۔ اور دانے توڑ توڑ کر تاراں کے منہ میں ڈالنے لگا۔ اور اِکڑ ڈُکڑ گننے لگا ——— "اِکڑ ڈُکڑ بمبّا بھو اسّی نوّے پورا ڈھارا سو! ——— لو اب تم کھلاؤ!"

یکایک تاراں مجھ سے انگوروں کا گُچھا چھین کر بھاگ نکلی۔ وہ بھاگتی جاتی تھی اور چیختی جاتی تھی "نہیں کھلاتے! نہیں کھلاتے!! نہیں کھلاتے!!!"

وہ آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ اور میں چیختا چلاتا اُس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اور دوڑتے دوڑتے ہم دونوں کو یہ خیال نہ رہا کہ ہم کہاں آگئے ہیں۔ یکایک ہم دونوں اپنے بنگلے کے برآمدے میں کھڑے ہانپ رہے تھے۔ اور میری ماں نے تاراں کو پکڑ لیا تھا۔ اور اُسے زور زور سے طمانچے اور مُکّے مار مار کر کہہ رہی تھی ——— "کم بخت کمینی۔ اچھوت۔ کم ذات لڑکی، آج پورن ماشی کے شُبھ دن پر میرے بچّے کے ساتھ کھیلتی ہے! جبھی تو وہ اچھا نہیں ہوتا! دیکھ تو سہی، آج میں تیری ہڈیاں توڑ کر رہوں گی!"

اور میری ماں واقعی اتنے غصّے میں تھیں کہ اگر میرے پتاجی تاراں کی مدد کو نہ آجاتے تو وہ ضرور اُس کی ہڈیاں توڑ ڈالتیں۔ میرے پتاجی نے روتی ہوئی تاراں کو اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ اور اُسے باغیچے میں لے گئے۔ اور اُس کی جھولی سُرخ سُرخ سیبوں سے بھر دی۔ اور اُن خوب صورت سیبوں کو

دیکھ کر روتی ہوئی تاراں ساری مار بھول گئی۔ اور اپنے آنسوؤں میں مسکرانے لگی۔ اور میرے پتا جی نے میری ماں سے کہا۔" خبردار جو آئندہ تم نے میرے بیٹے کو تاراں سے کھیلنے کو منع کیا!"

"تاراں اچھوت ہے۔ چمار کی بیٹی ہے!"

"چمار کی بیٹی ہے تو کیا ہوا۔ انسان نہیں ہے؟"

"تم اپنے دھرم کو اپنے پاس رکھو۔ میں اپنے بیٹے کو تمہاری طرح ناستک نہیں بننے دوں گی ——— کیوں میرے لال؟"

میری ماں مجھے پچکارتے ہوئے بولیں۔" تو میرا بیٹا ہے نا؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔" ہاں! . . . . ." مگر میری نگاہیں تاراں کی سیبوں سے بھری جھولی پر لگی ہوئی تھیں۔

"تو میری بات مانے گا نا؟"

ہاں! ——— میں نے آہستہ سے کہا۔ مگر میری نگاہ بس وہی سُرخ سُرخ سیب مچل رہے تھے۔

"اچھا بتا۔ تجھے کونسا دھرم پسند ہے۔ میرا یا اپنے پتا کا؟"

میں نے کہا۔" مجھے وہ سیب پسند ہیں!"

میرے پتا زور سے ہنسے۔

میری ماں نے زور سے مجھے طمانچہ مارا اور غصّے سے بولیں۔" بتا تجھے کونسا دھرم پسند ہے؟ میرا یا اپنے پتا کا؟"

میں نے روتے روتے ایک اُنگلی اُٹھا کر کہا۔" مجھے وہ سیب پسند ہیں!

اس واقعے کو گزرے ہوئے ایک عرصہ بیت گیا ہے، زندگی کے پُل کے نیچے سے پانی کتنی سُرعت سے بہہ رہا ہے - چالیس سال سے میں نے کسی سیب کی شاخ پر ایک کلی کو کھلتے ہوئے نہیں دیکھا - مجبوس اُمیدوں نارسیدہ آرزوؤں اور سفّاک خود غرضیوں کے تاریک اور ٹیڑھے میڑھے راستے سے گزرتا ہُوا میں جیل خانے کی اس سلاخوں سے پیچھے کی طرف جب بھی جھانکتا ہوں تو مجھے اپنے ذہن میں وہی آٹھ سال کا بچہ نظر آتا ہے جس کی ماں اُسے طمانچے پر طمانچے مار کر پوچھ رہی ہے؟

بتا تجھے کون سا دھرم پسند ہے ———— اور وہ بچہ طمانچے کھا کھا کر بھی ہٹیلے انداز میں سُرخ سیبوں کی طرف اُنگلی اُٹھا کر کہتا ہے۔

مجھے وہ سیب پسند ہیں! مجھے وہ سیب پسند ہیں!! مجھے وہ سیب پسند ہیں!!!

اگر ہمارے بچپن کے سپنے ہمارے رہبر ہوتے۔ تو یہ دُنیا کتنی مختلف ہوتی!

کاش!

۲

جب سے ماں جی میکے گئی ہیں ۔ میرے پتا جی بہت خوش تھے ۔کیونکہ میری ماں نے پانچ سال کے بعد میکے جانے کا نام لیا تھا ۔" اور اتنا عرصہ ساتھ رہنے سے آدمی اُدب جاتا ہے ۔" پتا جی سردار کرپال سنگھ مشیر مال سے کہہ رہے تھے ۔" یعنی جب دیکھئے مرد عورت ایک دوسرے کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں ۔کبھی ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتے ۔اتنے عرصہ تو اگر بھگوان بھی میرے ساتھ رہے تو مجھے اُس سے نفرت ہو جائے ۔ عورت تو پھر عورت ہے ۔"

" واہ کیا بات کرتے ہو ۔؟" سردار کرپال سنگھ کھڑک کر بولے ۔" میری گھر والی تو اکیس سال سے میکے نہیں گئی ۔ ہمارا جی تو کبھی ایک دوسرے سے نہیں اُوبتا ۔؟"

"آپ کی دوسری بات ہے سردار جی! میرے پتا جی بولے۔" آپ مشیر مال ہیں۔ آپ کو مہینے میں بیس دن باہر علاقے میں دورے پر رہنا پڑتا ہے۔ اب دیکھئے بیوی اپنے میکے گئی ہے۔ پانچ سال کے بعد۔ تو یہ گھر کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنے آپ کو کس قدر آزاد، بے فکر اور آوارہ منش محسوس کرتا ہوں۔ تین چار ماہ کے بعد مجھے معلوم ہے۔ بیوی کی یاد ستانے لگتی ہے۔ پھر اُس کا آنا کتنا اچھا معلوم ہوگا۔ میرے خیال میں تو عورتوں کو زبردستی تین ماہ کے لئے میکے بھیجدینا چاہیئے۔ راجہ صاحب کو اس امر کے لیے ایک قانون نافذ کرنا چاہیئے۔

سردار کرپال سنگھ ہنس کر بولے۔" راجہ صاحب کا بس چلے تو اپنے محل کی ساری رانیوں کو زندگی بھر کے لیے میکے بھیجدیں۔ اور پھر اپنا حرم نئی رانیوں سے سجالیں۔ مگر اس قسم کی باتیں بس راجاؤں ہی کو زیب دیتی ہیں کرتاروی ماں کہہ رہی تھیں۔ کہ تم جا کے ایک روز اُن کو گھر پر کھانے کے لئے بُلالو۔ اس لیے میں حاضر ہُوا تھا۔

"مگر میں تو کل کرمان کے ڈھلکے پر جا رہا ہوں۔"

"ٹراؤٹ مچھلی کے شکار کے لیے۔؟" کرپال سنگھ نے حیرت اور مسرت کا مِلا جُلا اظہار کرتے ہوئے کسی قدر حسرت سے پوچھا۔

"ہاں! آپ بھی چلئے نا!" پتا جی نے دعوت دے دی۔

"نہیں بھائی۔ میں کہاں جا سکتا ہوں؟ ابھی تو دورے سے واپس آیا ہوں۔" کتنے دن رہیں گے آپ وہاں پر؟"

"ایک ہفتہ تو رہوں گا۔ اور اگر جی لگ گیا تو دس دن رہ جاؤں گا۔"

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔ مگر کرمان سے واپسی پر ایک روز ہمارے گھر پر ضرور بیٹھک ہوگی۔ ورنہ تمھاری بھابی بہت خفا ہوں گی۔"

"بھابی جی کو میری طرف سے دونوں ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہنا بھیا۔ میں آتے ہی خود خبر کر دوں گا۔"

سردار کرپال سنگھ کے جانے کے بعد ہی میں خوشی سے اُچھلنے اور ناچنے لگا۔ اور تالیاں بجا بجا کر کہنے لگا۔ "آہا جی! ہم کرمان جائیں گے۔ ٹراؤٹ مچھلی کے شکار کو جائیں گے۔"

دراصل میں ماں کے ساتھ میکے چلا گیا ہوتا۔ اگر پتا جی نے چپکے سے مجھے ٹراوٹ مچھلی کے شکار کا لالچ نہ دیا ہوتا۔ اور کرمان کا ڈھاکہ سنا ہے۔ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ وہاں چھ ہزار فٹ کی بلندی پر اشمان نام کی ایک جھیل ہے۔ جو دو میل لمبی اور چوڑی ہے۔ وہاں راجہ جی کا ایک ڈاک بنگلہ بھی ہے۔ بڑی خوبصورت جگہ ہے۔

"اگر تم رہ جاؤ گے تو ہم تمھیں کرمان لے چلیں گے۔"

پتا جی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اور اس وعدے کے لالچ میں میں نے ماں جی کے ساتھ میکے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ "میں تو پتا جی کے ساتھ رہوں گا۔" میں نے ضد کر کے کہا تھا۔

ماں جی نے مجھ سے بیٹری سے چلنے والی کھلونا موٹر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر چابی سے چلنے والی موٹر تو میرے پاس دو تھیں۔ اس لیے بیٹری سے

چلنے والی موٹر کا لالچ مجھے کچھ اتنا پُر کشش نہ معلوم ہُوا۔ کہ میں اُس پر کر ماں کی سیر کو قربان کر سکتا۔ ہاں اگر وہ مجھے بڑے شہر میں لے جاکر چڑیا گھر دکھانے کا وعدہ کریں تو مَیں . . . . . . مَیں نے انتہائی سنجیدگی سے سودا بازی کرتے ہوئے کہا۔

"تو رہو اپنے پتاجی کے پاس!" ماں جی جھنجلا کر بولیں۔ "میں کہاں تمھیں اپنے ساتھ لے جانے پر خوش ہوں۔ یہاں رہ کر تم اپنے پتاجی کو تنگ کروگے۔ اور کیا کروگے۔ کیا میں جانتی نہیں ہوں!"

"نہیں، میں تنگ نہیں کرونگا" میں نے کہا۔

"نہیں یہ تنگ نہیں کرے گا" پتاجی بولے۔

"جب تم دونوں باپ بیٹے کی صلاح ایک جیسی ہے۔ تو میں دخل دینے والی کون؟" ماں جی اکیلی پڑ گئیں۔ اور قریباً رُوہانسی ہو کر بولیں۔ اس وقت مجھے ماں جی پر بڑا پیار آیا۔ اور میں اپنے پتاجی کی گود سے نکل کر ماں جی کی گود میں چلا گیا۔ اور اُن سے لاڈ کرتے ہوئے بولا۔

"میں تو پتاجی کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ میں تو تیرے ساتھ میکے چلوں گا۔ اپنے ناناجی کے گھر۔ آہا جی اپنے ناناجی کے گھر، اپنے ناناجی کے گھر!" مَیں خوشی سے تالی بجانے لگا۔

ماں جی نے اپنے آنسو پونچھ دیئے۔ اور خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے پتاجی کی طرف دیکھ کر بولیں۔ "میرا راجہ بیٹا تو میرا راجہ بیٹا ہے۔ تو میرے ساتھ جائے گا! تو میرے ساتھ جائے گا۔"

ماتا جی کے لہجے میں فتح کی چمک تھی۔ پتا جی اُٹھ کر باہر چلے گئے۔

لیکن جب جانے کے لیے تیاریاں مکمل ہو چکیں اور میں نے مخمل کا اُودا کوٹ اور نیکر پہن لیا۔ اور پاؤں میں براؤن رنگ کے چمکتے ہوئے جوتے پہن لیے۔ اور جب ماں جی پوجا کے کمرے میں آخری بار ماتھا ٹیکنے کے لیے گئیں اُس وقت پتا جی آہستہ سے میرے کان میں بولے۔

"میں نے سوچا تھا تم کو کرمان لے چلوں گا۔"

"کرمان میں چڑیا گھر ہے؟"

"نہیں!"

"کرمان میں بجلی بیٹری موٹر ہے۔؟"

"نہیں!"

"پھر۔؟"

پتا جی آہستہ سے بولے "میں سوچ رہا تھا۔ ہم تینوں مچھلیوں کا شکار کرتے۔ تم۔ میں اور تاراں!"

"تاراں ہمارے ساتھ چل سکتی ہے؟" میں نے ایک دم چلا کر کہا۔

"شِش چُپ رہو!" پتا جی فوراً میرے مُنہ پر اُنگلی رکھ کر بولے۔ "تمھاری ماں سُن لے گی تو تمھیں زبردستی اپنے میکے لے جائیگی۔ لیکن اگر تُم یہاں رہنے کا وعدہ کرو تو میں تاراں کو بھی ساتھ لے چلوں گا!"

میں نے بڑی کوشش سے اپنی مسرت کو چھپانے کی کوشش کی۔ مگر پھر بھی میرے ہونٹوں کے کنارے ہنسی سے پھٹے پڑتے تھے۔ اور میری آنکھوں کی

مسرت آمیز جھلک دل کا راز کہے دیتی تھی۔ جب ماں جی پُوجا کے کمرے سے لوٹیں۔ تو میں نے اُن سے ٹھنک کر کہا۔

"نہیں ہم ناناجی کے پاس نہیں جائیں گے۔ ہم پتاجی کے پاس رہیں گے۔"

ماں نے میری طرف دیکھا۔ پھر گھُور کر پتاجی کی طرف دیکھا۔ پتاجی نے اپنی آنکھیں جُھکا لیں۔

"تم نے اُس سے کچھ کہا ہے۔؟"

"نہیں!"

"ضرور کچھ کہا ہے۔ ورنہ یہ عین چلتے وقت کیسے پلٹ گیا۔"

"ہم ناناجی کے پاس نہیں جائیں گے۔" میں ٹھنک کر کہہ رہا تھا۔

پتاجی بولے۔ "میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ قسم لے لو۔"

"ہم نہیں جائیں گے۔ ہم نہیں جائیں گے۔ ہم نہیں جائیں گے۔" میں نے وٹی ہوئی نہارنی کی طرح باربار کہنا شروع کیا۔

ماں جی نے غصّے سے جھنجھلا کر مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔ کہ پتاجی نے آگے بڑھ کر ہاتھ روک لیا۔ ملتجیانہ لہجے میں بولے۔

"رانو! تو بھی جارہی ہے۔ اور بچے کو بھی لے جارہی ہے۔؟ ایک تو تیرے ہی جانے سے جی اُداس ہے۔! اب بچہ بھی تُو ساتھ لے گئی تو جُدائی کے یہ دن کاٹنے مشکل ہوجائیں گے!"

میرے پتاجی کی آواز بھرا گئی تھی۔

یکایک میری ماں کا سارا غصّہ فرد ہوگیا۔ وہ یکایک میری طرف سے پلٹ کر

پتا جی کے پاس چلی گئیں۔ اور اُن کے سینے سے لگ کر بڑے ملائم لہجے میں بولیں۔" تو تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ میں اتنی ضد نہ کرتی۔ اگر تم کہو میں میکے نہیں جاتی۔!"

" نہیں، نہیں " پتا جی گھبرا کر جلدی جلدی بولے "۔ اب ایسا بھی نہیں ہے۔ ایسا میں سنگدل نہیں ہوں۔ کہ پانچ برس کے بعد تمھیں میکے نہ جانے دوں۔ آخر کیا میں انسان نہیں ہوں۔ کیا میں عورت کے جذبات نہیں سمجھتا۔ آخر تمھارا دل بھی تو اپنی ماں، اپنے باپ، بھائی بہنوں سے ملنے کو چاہتا ہو گا نہیں نہیں ... میں کسی نہ کسی طرح تمھاری جدائی کے دن گذاروں گا۔"

ماں جی اِکدم خوش ہو کر بولیں"۔ میں بچے کو تمھارے پاس چھوڑے جاتی ہوں۔ مگر کاکے کا خیال رکھنا۔"

" میرا اپنا بچہ ہے۔"

" لال شربت ہر روز پلانا۔"

" روز پلاؤں گا۔"

" اور کیلشیم کی گولیاں بھی۔"

" اچھا!"

" اور کھانے کے بعد فولاد کا شربت۔!"

" ٹھیک ہے۔"

" اور باہر سردی میں نہیں گھومنے دینا۔"

" درست ہے۔"

"اور تاراں کل مُونہی سے کھیلنے نہ دینا۔ اُس کم بخت کے سر میں جوئیں ہی جوئیں ہیں۔ میرے بچے کے بالوں میں جوئیں آجائیں گی۔!"

"میں اُس سؤر کی بچی کو بنگلے کے نزدیک نہیں پھٹکنے دوں گا" میرے پتاجی نے گرج کر کہا۔

میری ماں نے پتاجی کے سینے سے لگے لگے اطمیناں کا سانس لیا اُن کے چوڑے چکلے سینے پر آہستہ سے اُنگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں "تم کتنے اچھے ہو؟"

ماں جی کے جانے کے آٹھ دن بعد ہم لوگ کرمان کے ڈھاکے روانہ ہوئے جانے سے پہلے پتاجی نے تاراں کی ماں اور اُس کے باپ سے تاراں کو ساتھ لے جانے کی اجازت لی تھی۔ اُس کے لیے کپڑوں کے دو نئے جوڑے سلوائے تھے۔ گہری سُرخ سُوسی کی دو نئی شلواریں اور ایک سیاہ چھینٹ اور دوسری نیلی پھولدار چھینٹ کی قمیص۔ اور اُس کے اوڑھنے کے لئے ایک گلابی اور نیلی چُنی۔ اور ایک روز پہلے ہماری ملازمہ بیگماں نے اُسے اچھی طرح سے نہلا کر اُس کے بالوں کی ساری جوئیں مار دی تھیں۔ اور اُس کے بالوں میں خوشبودار تیل ڈال کر اُس کی مینڈھیاں سنوار دی تھیں۔ اور اب تاراں اپنے نئے لباس میں مغرور اکیلی ایک خچر پر بیٹھی میری طرف اس طرح دیکھی تھی۔ جیسے میں چمار کا بیٹا ہوں۔ اور وہ راجہ کی بیٹی ہے۔ اور مجھے غصّہ تو بہت آیا تھا۔ اور میں اُسے پیٹ دیتا۔ مگر پتاجی کا ڈر تھا۔ کیونکہ پتاجی اُس سے بڑی نرمی سے بات کرتے تھے۔ راستے میں اگر کچھ کھانے کو مانگتے۔ تو سب سے پہلے وہ اُسے دیتے۔ بعد میں مجھے۔ اور جب

وہ اور میں سفر میں خچروں پر بیٹھے بیٹھے تھک جاتے اور ہمارے پاؤں میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ تو میرے پتاجی سب سے پہلے تاراں کو خچر سے اُتارتے اور بعد میں مجھے۔ پھر ایک ہاتھ سے تاراں کی اُنگلی پکڑ لیتے اور دوسرے ہاتھ کی انگلی میرے ہاتھ میں تھما دیتے اور زیادہ عرصہ تاراں سے باتیں کرتے رہتے۔ اور تاراں مارے غرور کے پھُول کر کُپّا ہوئی جارہی تھی۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کرمان پہنچ کر تاراں کو ضرور پیٹوں گا۔ جس قدر میرے پتاجی اُس سے ہنس ہنس کر بات کرتے اتنی ہی مجھے اُس سے نفرت ہوتی جارہی تھی۔ میرے خیال میں ماں ٹھیک کہتی تھیں۔ یہ کم بخت ہی چڑیل۔ مرگھلی۔ دیکھو تو پتاجی کی کسی بات پر کیسے ٹھی ٹھی ہنس رہی ہے۔ مرجانی اگندی چمارن۔

یکایک میرے خچر کو ٹھوکر لگی اور میں زین سے اُچک کر خچر کی گردن پر آرہا۔ خچر والے مرقبان نے فوراً آگے بڑھ کر مجھے سنبھالا ورنہ میں گر گیا ہوتا تاراں ہنس ہنس کر مجھے چڑاتے لگی۔

دن ڈھلنے سے پہلے ہم لوگ کرمان کے ڈھاکے پر پہنچ گئے۔ یہاں پر بہت سردی تھی۔ بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ چھ ہزار فٹ کی چوٹی پر ایک لمبا چوڑا میدان پھیلا ہوا تھا۔ جس کا چپہ چپہ نرم نرم اور ہری ہری گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ اِس میدان میں بکریوں کے گلّے چر رہے تھے۔ میدان کے بیچوں بیچ نشیب میں اشماں جھیل تھی جھیل کا پانی مغربی کنارے کو توڑ کر ایک ندی میں بہہ رہا تھا۔ نیلے پانی والی ندی چھوٹے چھوٹے نیلے پتھروں پر شور مچاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ اِسی ندی پر میرے والد ٹراؤٹ مچھلی کا شکار کھیلنے آئے

تھے ۔ ندی کے کنارے جہاں ندی جھیل سے جُدا ہوتی تھی۔ وہاں پر راجہ صاحب کا ڈاک بنگلہ تھا۔ اور دس بارہ سیڑھیوں کا ایک چھوٹا سا پختہ گھاٹ تھا۔ جس کے کنارے دو کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ڈاک بنگلے کے پیچھے تُنگ کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ اور اسی طرح کے چار پانچ درخت ندی کے کنارے کنارے دُور دُور کھڑے تھے۔ اور یہ اتنے بڑے بڑے درخت تھے۔ اور اتنے گھنے تھے کہ اُن کے نیچے بکر والوں نے اپنے خیمے لگائے تھے۔ اور خیموں سے باہر چولہوں میں آگ جل رہی تھی۔ اور بکر وال عورتیں اپنے سر کے دونوں طرف بالوں کی مینڈھیاں لٹکائے کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں پہنے مکّی کی روٹیاں سینک رہی تھیں۔ یہ منظر مجھے بڑا عجیب اور بڑا اچھا لگا۔

ڈاک بنگلے کے قریب پہنچ کر ہم لوگ اپنی سواری کے خچروں سے اُترے ہمارے سواری کے تین خچر تھے۔ اور خچّروں پر خیمے، چھولداریاں اور کھانے پینے کا سامان لدا تھا۔ دو اردلی اور دو نوکر مل کر ڈاک بنگلے کے باہر لکڑی کے کلّے ٹھونک کر خیمے اور چھولداریاں کھڑی کرنے لگے۔ اور ہم تینوں چوکیدار کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ڈاک بنگلے میں داخل ہوئے۔

پھر بہت جلدی سورج غروب ہوگیا۔ اور کھڑکیوں کے پردے تیز ہوا سے لرزنے لگے اور سائیں سائیں کرتی ہُوا کھڑکی کے کانچوں سے ٹکرانے لگی۔ پتا جی نے اُٹھ کر کھڑکیاں بند کیں۔ آتشدان میں آگ جلوائی۔ بستر بچھوائے۔ ہم لوگوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ وہ باری باری کبھی میرے مُنہ میں اور کبھی تاراں کے منہ میں لقمے ڈالتے جاتے تھے۔ اور ہمیں اس طرح کھانے کا بڑا مزا آرہا

تھا۔ پھر میرے پتا جی نے ہم دونوں کو گود میں لے کر ایک بہت اچھی پریوں والی کہانی سنائی۔ اور جب کہانی سنتے سنتے ہمیں نیند آنے لگی۔ تو انھوں نے ہم دونوں کو اٹھا کر ساتھ والے بستر پر لٹا دیا۔ تاراں کا چھوٹا سا ہاتھ میری گردن پر تھا۔ اور وہ میرے بالکل قریب لگ کر سو گئی تھی۔ پھر میں بھی سو گیا۔ اور نرم گرم گہرے اندھیرے نے ہمیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے بعد میں بہت جگہوں پر گھوما ہوں اور بڑے خوب صورت مناظر دیکھے ہیں۔ اور بہت سے اجنبی ملکوں کی سیر کی ہے۔ مگر ایسی میٹھی معصوم اور موہنی شام میری زندگی میں کبھی نہیں آئی۔ . . . . آج بھی کئی بار جب میں کسی انجانے سفر پر چلتا ہوا کسی اجنبی سرائے کے کمرے میں اکیلا سوتا ہوں مجھے اپنی گردن پر تاراں کا چھوٹا سا ہاتھ رکھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور دفعتاً میں سوتے سے گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہوں اور اپنے خالی بستر کو دیکھ کر حیران اور اداس ہو جاتا ہوں۔ اور میرے چاروں طرف تیز ہوا گھومتی ہے۔ اور بند کھڑکیوں کو دستک دیتے ہوئے لڑکھڑاتی ہے اور میں سوچتا ہوں نہ جانے وہ ننھے ننھے ہاتھ آج کہاں ہیں۔ نجانے انھوں نے اپنے لیے کیسے ساتھی چن لیا ہے۔ نہ جانے وہ کس کے بچے کو پالنے میں جھلا رہی ہوگی۔ اور ان ہاتھوں کا میری گردن سے کیا رشتہ ہے۔؟ یہ میں آج تک نہیں معلوم کر سکا۔

دوسرے دن صبح جب ہم اٹھے تو پتا جی اپنے بستر پر نہ تھے۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اور کھڑکیوں کے پردے ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ اور صبح کی خنک سہانی دھوپ ہمارے بستر پر پڑ رہی تھی۔ باورچی نے ہمیں بستر ہی

میں ناشتہ دے دیا۔ اور تاراں نے اِس طرح کھایا گویا وہ زندگی بھر بھوکی رہی ہو۔ اس کے بعد ایک اردلی نے ہمیں باری باری گرم پانی سے نہلایا۔ سفر کے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہنا دئے۔ پھر میں نے اپنے بکسے میں سے ربڑ کی گیند نکالی۔ اور کودتے پھاندتے ندی کی طرف چلے۔ جدھر صبح ہی سے پتاجی مچھلی کے شکار کے لیے گئے ہوئے تھے۔

گیند گھاس پر سے پھسلتی جا رہی تھی اور میں اور تاراں اُس کے پیچھے خوشی سے چیختے چلاتے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ گھاس بہت گہری اور تہہ دار تھی۔ چلتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس گھاس کے نیچے ہمارے صوفے کے سپرنگ لگے ہوں۔ دوڑتے دوڑتے ایک جگہ انجوں کے نیلے نیلے پھولوں کے قطعے نظر آ گئے۔ اُنھیں دیکھ کر میں نے تاراں کو پھولوں پر گرا دیا۔ اور پھر خود بھی پھولوں پر لوٹنے لگا۔ ہم دونوں لوٹتے لوٹتے پھولوں کے تختے سے باہر نکل آئے اور اُسی طرح گھاس پر لوٹتے لوٹتے دُور تک چکر کھاتے چلے گئے۔ اب ہماری نظروں میں زمین اور آسمان گھوم رہے تھے۔ تنگ کے پیڑ حدِ نگاہ پر یکایک بلند ہو کر ڈبکی کھاتے تھے۔ آسمان گھوم کر تیرتی ہوئی ندی میں رل جاتا تھا۔ اور ندی اُچھل کر پھولوں کے تختوں میں جا گرتی تھی اور اِن سب کے اُوپر دُھوپ کی سنہری پھوار سی گر رہی تھی۔

لوٹتے پوٹتے جب ہم نرگس کے پھولوں کے ایک بہت بڑے تختے کی طرف جانے لگے۔ کیونکہ ہماری گیند بھی اُدھر ہی گئی تھی۔ تو ہم نے کیا دیکھا کہ یکایک نرگس کے پھولوں کے تختوں کو پھلانگتا ہوا ایک کالا کتّا کہیں سے آیا۔

اور گیند کو اپنے مُنہ میں لے کر بھاگا۔ اور آنکھ جھپکتے ہی نرگس کے پھُولوں کے دوسری طرف اوجھل ہو گیا۔

جہاں سے کُتا گزرا تھا۔ وہاں پر لانبی لانبی ڈنڈلیوں پر نرگس کے پھُول ابھی تک سو رہے تھے اور اُن کی آنکھیں بالکل اسی طرح اُداس تھیں گویا اُنھیں بھی ہماری گیند کے کھو جانے کا غم ہو!

میں نے تاراں کی طرف دیکھا۔ تاراں نے میری طرف دیکھا۔ پھر ہم دونوں جلدی سے گھاس سے اُٹھ بیٹھے اور دھیرے دھیرے ہاتھ پکڑ کر نرگس کے تختے کے دوسری طرف جانے لگے۔ جدھر کُتا گیا تھا۔ مگر دل میں خوف تھا۔ کیونکہ وہ ایک سیاہ کالا کُتا تھا۔ اور بہت بڑا کُتا تھا۔

پھولوں کے تختے کی دوسری طرف یکایک ندی کا کنارہ نظر آیا۔ کنارے پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اور کُتے کے مُنہ سے گیند نکال کر بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ لال پیلے اور سبز تین رنگوں والی میری ربڑ کی خوب صورت گیند تھی۔ جواب اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اور اُس کے قریب کھڑا ہُوا کُتا ہماری طرف دیکھ کر شرارت سے بھونک رہا تھا۔

وہ آدمی ہم دونوں بچوں کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے کُتے کو ڈانٹا۔ "چُپ رہ کالو!" کُتا چُپ ہو گیا اور دُم ہلانے لگا۔

وُہ بڑا عجیب سا آدمی تھا۔ کمر تک بالکل ننگا تھا۔ اور کمر سے نیچے اُس نے کالے پٹو کا ایک چُست پاجامہ پہن رکھا تھا۔ جو صرف اُس کے گھٹنوں تک آتا تھا۔ گھٹنوں سے نیچے وہ پھر ننگا تھا۔ اُس کے کندھے پر سے کمر

تک جنیو کا دھاگا لٹک رہا تھا۔ اور اُس کا رنگ بے حد سفید تھا۔ اور اُس کی آنکھیں بہت نیلی تھیں۔ اور اُس کے چہرے پر سُرخ رنگ کی چھوٹی سی داڑھی تھی۔ اور جب وہ گیند کو اپنے ہاتھ میں ٹٹولتا ہُوا ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ تو میرا سارا ڈر جاتا رہا۔ میں نے کہا "یہ گیند میری ہے۔ مجھے دے دو"

گیند اُس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے آرہی۔ نیچے آتے ہی گیند دو تین بار اُچھلی۔ تیسری بار گُتے نے پھر اُسے پکڑ لیا۔ گیند کو خود بخود اُچھلتے دیکھ کر وہ آدمی بے حد ہنسا جیسے زندگی میں پہلی بار ربڑ کی گیند دیکھ رہا ہو۔

"میری گیند مجھے دے دو" میں نے ذرا تحکمانہ لہجے میں کہا۔ اُس نے گھبرا کر فوراً گیند میری طرف پھینکی میں نے فوراً دبوچ لی۔ وہ بڑی حیرت سے اُس گیند کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہ کس چیز کی بنی ہے۔؟"

"ربڑ کی ہے"

"ربڑ کیا ہوتا ہے؟"

"تمھارا سر ہوتا ہے" میں نے بڑی نخوت سے جواب دیا۔

"تم ڈاکٹر صاحب کے لڑکے ہو؟" اُس آدمی نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور اُس سے پوچھا۔

"پتا جی کہاں ہیں۔؟"

وہ بولا "وہ میدان کے کنارے پر جہاں تنگ کا آخری پیڑ دکھائی دیتا ہے نا۔ وہ وہاں مچھلی کا شکار کر رہے ہیں"

نظر تو نہیں آتے۔؟ میں نے دُور اُس تُنگ کے پیڑ کی طرف نظر دوڑا کر کہا۔

"وہ پیڑ کے دوسری طرف ہیں۔ چلو میں تمھیں وہاں پہنچائے دیتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر اُس نے جُھک کر ندی کنارے سے رکھا ہُوا لکڑیوں کا ایک گٹھا اُٹھایا اور اُسے سر پر رکھ کر ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

بہت جلد بھاگتے دوڑتے ہم تو اُس آدمی سے بہت پہلے اپنے تیاجی کے پاس پہنچ گئے۔ وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے اپنی ولایتی بنسی کی ڈوری کو پانی میں ڈالے اپنی اَدھ مُندھی آنکھوں سے ندی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دیکھ رہے تھے کہ سو رہے تھے۔ ہمیں تو یہی لگا کہ سو رہے تھے۔ کیونکہ ہمارے آنے پر وہ اکدم چونک گئے اور ہماری طرف دیکھ کر انھوں نے ہمیں پہچانا کر کس قدر تنک مزاج ہو کر بولے۔

"تم آ گئے نا! اب شکار ہو چکا!"

"کیوں نہ ہو گا۔؟" میں نے پوچھا۔

"تمھارے شور سے مچھلیاں خبردار ہو گئی ہیں۔"

میں نے نیچے پانی میں مچھلیوں کی طرف دیکھا۔ جہاں پر پانی گہرا تھا۔ وہاں تہ تک دکھائی دیتی تھی۔ اور تہ کی دُھلی ہوئی شفاف بجری اور ریت بھی۔ تُنگ کے پتوں سے دُھوپ چھن چھن کر پانی میں پڑتی تھی۔ مچھلیاں اُس روشنی میں کہیں تو چمک اُٹھتیں کہیں گہرے سایوں میں کھو جاتیں۔ کہیں پر دو دو تین تین کی تعداد میں لچکتی ہوئی چلی جا رہی تھیں۔ ایک جگہ ایک بڑے

نیلے سے پتھر کے گرد دو مچھلیاں گھوم رہی تھیں ۔ یکایک وہ دونوں مچھلیاں پتھروں کے نیچے گم ہو گئیں ۔

میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا ” یہ مچھلیاں کہاں گئیں ؟ “

اِس پتھر کے نیچے ان کا گھر ہے ۔ نیلے پتھر کی چھت ہے چھت کے نیچے شفاف ریت کا خوب صورت بستر ہے ۔ دن بھر یہ اس پانی میں تیرتی ہیں ۔ اسی پانی سے انھیں اپنی غذا مل جاتی ہے ۔“ میرے والد نے مجھے بتایا ۔

تاراں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ” ہائے میرا جی چاہتا ہے ۔ میں بھی ایک مچھلی ہوتی ۔ اور اِسی طرح پانی میں تیرتی تیرتی کہیں بہت دُور چلی جاتی “

میرے پتا جی کچھ کہنے والے تھے کہ اتنے میں کالو اور اُس کا مالک آگیا اور اُس کو ہمارے پیچھے آدھے ننگے آدمی نے جس کے سر پر لکڑیوں کا گٹھا تھا ۔ آکر میرے باپ کو سلام کیا ۔ پتا جی نے اُس کے جنیو کی طرف دیکھ کر کہا ” تم براہمن ہو ؟ “

” جی ! “

” تمھارا نام کیا ہے ؟ “

” ڈولا ۔ “

” کیا یہ کُتا تمھارا ہے ؟ “

” جی ! “

” تم کیا کام کرتے ہو ؟ “

” جب ڈاک بنگلے پر کوئی افسر آتا ہے تو نیچے جنگل سے لکڑی کاٹ کے لاتا ہوں ! “

"اور جب کوئی افسر نہیں آتا ہے؟"

"تو یہی لکڑی بکروال لوگوں کے ہاتھوں بیچ دیتا ہوں۔"

"اور جب اس ڈھاکے کی گھاس سوکھ جاتی ہے اور بکروال لوگ کسی دوسرے ڈھاکے کو نکل جاتے ہوں گے۔ تب تم کیا کرتے ہو؟"

ڈولا نے میدان کے نیچے کی جانب ڈھلوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ گھر آپ دیکھتے ہیں۔ اُس گھر کے آس پاس کی ساری زمین میری ہے۔ ندی بہت سی زمین بہا لے گئی ہے۔ لیکن جو بچ گئی ہے۔ اس میں کھیتی باڑی کرتا ہوں۔"

"اس پہاڑی پتھریلی زمین میں کیا ہوتا ہوگا۔"

"مکا اُگاتا ہوں!"

میرے پتا جی چُپ ہو گئے۔ سر جُھکا کر بنسی کی ڈور لپیٹنے لگے۔ چند لمحے وہ آدمی اُسی طرح ہمارے سر پر کھڑا رہا پھر پلٹ کر اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

میرے پتا جی نے پوچھا۔

"کاکا تم نے کسی کسان کا گھر دیکھا ہے۔"

"نہیں پتا جی۔"

"چلو تمہیں دکھائیں۔"

میں نے ڈولا کا گھر دیکھا۔ مٹی کی چار دیواری تھی۔ مٹی کی چھت تھی جس میں سنٹھے کی جھاڑیاں کوٹ کوٹ کر بچھائی گئی تھیں۔ گھر میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ صرف ایک دروازہ تھا۔ ایک اندھیرے کونے میں ایک چولھا تھا۔ اس پر نیلے پتھر کا

ایک ترشا ہُوا ٹکڑا اوندھا پڑا تھا۔ جسے پہاڑی زبان میں "تراڑ" کہتے ہیں۔

میرے پتاجی نے پوچھا "وہ تراڑ کس لیے ہے۔؟"

ڈولا بولا "یہ تراڑ نہیں ہے۔ توا ہے"

"پتھر کا توا ؟" میرے پتاجی حیرت سے بولے۔

ڈولا نے آہستہ سے سر ہلایا۔ بولا "اس پر روٹی پکاتا ہوں !"

"اس پر روٹی پک جاتی ہے" میرے والد نے پوچھا۔ پھر اُنھوں نے میری طرف دیکھ کر کہا "دیکھا تم نے کسان کا گھر ؟"

میں نے کہا "مگر اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے !"

"بیٹے۔ کسان کا گھر اس بات سے نہیں پہچانا جاتا۔ کہ اُس میں کیا ہے۔ بلکہ اس بات سے کہ اُس میں کیا نہیں ہے !"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا۔ کہ اتنے میں کُتّے کے زور زور سے بھونکنے کی آواز باہر سے آئی۔

ہم سب لوگ جلدی سے باہر نکلے۔ ہم نے دیکھا کہ جس دیوار کے نیچے ڈولا نے اپنے لکڑی کا گٹھا گرایا تھا۔ وہاں پر اب ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اور اپنے سر پر وہی لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے تھی۔ اور کالو اُس کا راستہ روکے زور زور سے بھونک رہا تھا۔

ڈولا نے آتے ہی کالو کو بھگا دیا۔ کالو کو بھگا دیا۔ کالو دُور تو نہیں بھاگا ایک طرف کھڑا ہو کر بھونکنے لگا۔ لڑکی نے ڈولا کو دیکھا تو اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس نے جلدی سے لکڑی کا گٹھا زمین پر پھینک دیا۔ اور ایک طرف

کو بھاگنے کی کوشش کرنے لگی - ڈولا نے جلدی سے اُسے ہاتھ سے پکڑ لیا - اور بولا۔

" تو تُو میری لکڑیاں چُرانے آئی تھی - ؟"

لڑکی نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ اُس کی آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں - اور اُس کا سانولا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا - اور اُس کے پتلے پتلے ہونٹ خوف سے لرز رہے تھے اور وہ ہم سب کو دیکھ کر بالکل سہم گئی تھی - اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

" تم بکر والوں کی لڑکی ہو - ؟" ڈولا نے پوچھا -

لڑکی نے پھر دھیرے سے سر ہلایا -

" تمھارا نام ؟"

" نُورجا !"

" تُو لکڑیاں کیوں چُرا رہی تھی ؟" میرے پتا جی نے پوچھا -

" روٹی پکانے کے لئے ؟"

" تو خود جنگل سے کاٹ کر کیوں نہیں لاتی - ؟"

" مجھے جنگل میں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے ۔"

" تو اپنے بھائی کو بھیجدیا ہوتا ۔" میرے پتا جی نے کہا -

" میرا کوئی بھائی نہیں ہے ایک ماں ہے - وہ بڈھی ہے - میں دن بھر بھیڑوں کے گلّے کو سنبھالتی ہوں - ماں روٹی پکاتی ہے جنگل کون جائے - ؟"

" تو آج سے پہلے کون جاتا تھا - ؟"

"مانو جانو تھا۔"

مانو کون تھا؟ یہ ہم میں سے کسی کو معلوم نہ تھا۔ ڈولا بولا۔

"تو اب مانو کیوں نہیں جاتا؟"

لڑکی نے آنکھیں جھکا لیں۔ اُس کے پتلے پتلے ہونٹ لرزنے لگے وہ دھیرے سے بولی۔

"مانو نے شادی کر لی ہے!"

ڈولا دیر تک نُورجا کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اُس نے لڑکی کے قدموں میں پڑتے ہوئے لکڑی کے گٹھے کو اُٹھا کر اُسی لڑکی کے سر پر رکھ دیا اور بولا "آج لے جا مگر پھر کبھی چوری نہ کرنا۔"

ڈولا کسان کے گھر سے آکے میرے پتا جی پھر تُنگ کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر بنسی کے کانٹے میں ایک چھوٹا سا کیڑا لگاتے ہوئے بولے۔

"چار ننگی دیواریں۔ ایک ننگا فرش۔ پتھر کا توا۔ . . . . دیکھا بیٹا تم نے اِس کسان کو زندگی کی وہی تمام سہولتیں حاصل ہیں جو ایک ٹراؤٹ مچھلی کو میسّر ہیں۔"

"مگر ڈولا تو مچھلی نہیں ہے۔" تاراں نے پوچھا۔

"ڈولا تو مچھلی نہیں ہے چاچا جی۔"

"ہاں بیٹی نہیں ہے" میرے پتا جی نے بڑی اُداسی سے کہا۔ "مگر کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ مچھلی سے انسان بننے تک انسان نے جو کہ وڑوں برس کا فاصلہ طے کیا ہے۔ تو کس لیے طے کیا ہے۔؟"

پتاجی نے اُس کے بعد ہم سے بات نہیں کی اور چونکہ اُن کی بات ہمارے پلے نہیں پڑی تھی - اس لیے ہم بھی پتاجی کو مچھلی کے شکار میں مصروف چھوڑ کر اپنی گیند لے کر وہاں سے دُور گھاس کے میدان میں کھیلنے کے لیے چلے گئے -

میرے پتاجی بڑے عجیب آدمی ہیں کبھی کبھی ایسی باتیں کرتے ہیں - جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں -

اس واقعے کے تین دن بعد ہم لوگ اشماں جھیل کے کنارے نیلوفر کے پھولوں کے ہار بنا رہے تھے - کیونکہ پتاجی نے آج ہمیں کشتی میں جھیل کی سیر کرائی تھی - اور جھیل میں جابجا نیلوفر کے پھول چوڑے چوڑے پتوں پر تیر رہے تھے - اور اُن سپید اور گلابی گلابی سے پھولوں کو دیکھ کر تاراں کا جی للچا گیا تھا - اور میرے پتاجی نے اُسے جھیل کی سطح سے بہت سے پھول توڑ کر دیئے تھے - اب ہم ان پھولوں کو جمع کر کے ندی کنارے جہاں سے جھیل کا پانی ندی میں گرتا تھا بیٹھ کر اُن کے ہار بنا رہے تھے - تاراں ڈاک بنگلے کے چوکیدار سے کوئی اور دھاگا مانگ لائی تھی - اور بڑی مشاقی سے ہار بنا رہی تھی - ہار بنا کر ایک ہار اُس نے اپنے گلے میں پہن لیا تھا - اور ایک میرے گلے میں ڈال دیا تھا - اور باقی کے جو پھول بچ گئے تھے - اُس نے اُنھیں اپنے بالوں میں اُڑس لیا تھا - اور وہ اُس وقت بالکل جھیل کی رانی معلوم ہو رہی تھی -

عین اُس وقت ڈولا اپنے کتّے کو لے کر اُدھر سے گزرا - ہمیں کھیلتے دیکھ کر رُک گیا - اُس کے ہاتھ میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی بین پکی تھی - اُس نے ہمارے

قریب بیٹھ کر ندی کے دو پتھروں کے درمیان اُس لکڑی کی پن چکی کو پھنسا دیا۔
اور جب پن چکی اچھی طرح دو پتھروں کے درمیان پھنس گئی۔ تو اُس کے پہیے پانی
میں زور زور سے گھومنے لگے۔ بالکل اُس پن چکی کی طرح جہاں لوگ آٹا
پسواتے ہیں۔

تاراں نے چلّا کر کہا "میں یہ پن چکی لُوں گی۔ میں یہ پن چکی لُوں گی۔"
میں نے کہا "میں لُونگا۔ نہیں جی میں لُونگا۔ ڈُولا یہ پن چکی میری ہے۔"
ڈُولا نے کہا "میرے پاس دو پن چکیاں ہیں۔ اور میں ایک ایک پن
چکی تم دونوں کو دے سکتا ہوں۔"

"تو جلدی سے نکالو۔" میں نے بے تاب ہو کر کہا۔

"مگر ایک چیز مجھے بھی چاہیئے۔"

"کیا۔؟"

"وہ ربڑ کی گیند۔"

"نہیں جی۔ میں اپنی ربڑ کی گیند نہیں دونگا۔ کبھی نہیں دُونگا۔"
میں نے زور سے چلا کر کہا۔

تاراں کی للچائی ہوئی نگاہیں ابھی تک پن چکی پر گڑی تھیں۔ یکایک وہ
میری طرف دیکھ کر تحکمانہ لہجے میں بولی۔

"کیوں نہیں دوگے۔ تمھارے پاس تو دو ایسی گیندیں ہیں۔!"

"نہیں۔ میں نہیں دُونگا۔ میں نہیں دونگا۔ اور یہ پن چکی بھی لُونگا۔" میں نے
ضد کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا جیسی تمہاری مرضی !" ڈولا پتھروں کے بیچ میں سے اپنی پن چکی نکالتے ہوئے بولا۔

"نہیں اسے یہیں رہنے دو !" تاراں بڑی سختی سے بولی۔

"اسے گیند دے دو جی۔ نہیں تو میں تم سے نہیں بولونگی۔ کبھی نہیں بولونگی
راکدم کُٹّی کرلونگی !"

آخر میں مجھے گیند دینی ہی پڑی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔؟ ایک طرف تاراں روٹھی بیٹھی تھی۔ ایک طرف پن چکی چل رہی تھی ایک طرف وہ خوب صورت گیند تھی۔ میں نے ایک گہری آہ بھری اور آخرکار گیند ڈولا کے حوالے کر دی۔ ڈولا نے دوسری پن چکی بھی ندی کے کنارے دو پتھروں کے قریب کر کے اُن میں پھنسا دی۔ اور جب پن چکی اچھی طرح سے چلنے لگی تو میری گیند لے کر فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مبادا میں اپنا ارادہ نہ بدل دُوں۔!

"ہونہہ ! یہ گیند کو لے کر کیا کرے گا۔؟" میں نے تاراں سے پوچھا" گیند سے تو بچے کھیلتے ہیں۔ اور بڑے کبھی نہیں کھیلتے ہیں۔ میں نے تو اپنے پتاجی کو کبھی گیند سے کھیلتے ہوئے نہ دیکھا !"

"آہا جی ! میری پن چکی تمہاری پن چکی سے تیز چل رہی ہے۔!" تاراں خوشی سے تالی بجاتی ہوئی بولی۔ وہ میری گیند کو بالکل بھول چکی تھی۔

خود غرض چڑیل !

میں نے غصے میں آکر تاراں کے بال پکڑ کر نوچ دیئے۔ اور اُسے چُٹیا

سے پکڑ کر خوب پیٹا۔ مجھے گیند کے چلے جانے پر بہت غصہ آرہا تھا۔

دن بھر ہماری کٹی رہی۔ مگر شام کی چائے کے وقت پھر صلح ہو گئی۔ ہم لوگ ڈاک بنگلے کے برآمدے میں چائے پی رہے تھے۔ کہ ڈولا سر پر لکڑی کا ایک بھاری گٹھا اٹھائے ہوئے آیا۔ لکڑی کا گٹھا اس نے برآمدے کے فرش سے نیچے گھاس کے ایک قطعے پر پھینک دیا۔ خود پسینہ پونچھتے ہوئے برآمدے کے فرش پر ہمارے قدموں کے قریب بیٹھ کر سستانے لگا۔

میرے پتاجی نے اُسے چائے کی دو پیالیاں پلائیں اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب ڈولا چائے پی کر اچھی طرح سے سستا چکا تو اُٹھ کر چلنے لگا۔ چلتے چلتے رُک کر میرے پتاجی سے پوچھنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب یہ لوہے کا توا کتنے کا آتا ہو گا"

"میرے خیال میں دو ڈھائی روپے کا آتا ہو گا۔ کیوں؟"

"کچھ نہیں جی۔ یونہی پوچھا ہے"

اور جب ڈولا سر جھکائے کچھ سوچتا ہُوا وہاں سے چلا گیا۔ تو میرے پتاجی آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔

دو دن بعد ہمیں پتہ چل گیا۔ کہ ڈولا نے گیند کا کیا کیا تھا۔ میں اور تاراں نرگس کی اُونچی اُونچی ڈنڈلیوں والے پودوں میں گُکن میٹی کھیل رہے تھے۔ اور کوئی ہمیں دُور سے نہ دیکھ سکتا تھا۔ کہ یکایک تاراں نے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "شش وہ دیکھو!"

"کہاں؟"

تاراں نے نرگس کی چند ڈنڈیاں اپنے سامنے سے ہٹائیں۔ سامنے ندی کا کنارہ نظر آرہا تھا۔ ندی کے اُس پار نورؔ جا اپنے دونوں پاؤں پانی میں ڈالے ہماری گیند سے ریت پر کھیل رہی تھی۔ گیند بار بار اُچھلتی تھی۔ اور اُس کے ہاتھ میں آجاتی تھی اور نورؔ جا مُسکراتے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی۔ اور جہاں ہم چھپے بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہاں سے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔

میں نے کہا " یہ ہماری گیند تورؔ جا کے پاس کیسے آئی۔ ؟"

" چھی! تم بڑے بدھو ہو!" تاراں نخوت سے بولی " یہ گیند تورؔ جا کو ڈولا نے دی ہے۔"

" بھلا ڈولا نے اُسے میری گیند کیوں دی ہے ؟ میں ابھی جا کے اپنی گیند اُس سے چھین کے لاتا ہوں۔" میں نے بے حد خفا ہو کے کہا۔

میں اپنی جگہ سے اُٹھنے ہی والا تھا۔ کہ " شش " کہہ کر تاراں نے پھر مجھے اپنے پاس چھپا لیا۔ اب ہم نے دیکھا کہ ندی کے اِس کنارے سر پر لکڑیوں کا ایک گٹھا اُٹھائے ڈولا اِدھر ہی چلا آرہا ہے۔ جدھر ہم چھپے بیٹھے ہیں۔ تورؔ جا نے اُسے دیکھا تو خود بخود ہنس پڑی۔ اور گیند کو اپنی قمیص کی جیب میں ڈال کر جلدی سے پانی میں اُتر گئی۔ اُس نے اپنی شلوار گھٹنوں تک اُونچی کر لی تھی۔ اور پانی میں چلتے چلتے وہ دوسرے کنارے آکے ڈولا کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اور اُس کی آدھی ٹانگیں ابھی تک ننگی تھیں اور پانی میں بھیگی ہوئی تھیں اور ڈولا تورؔ جا کی طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جب تورؔ جا ڈولا کے بالکل قریب آگئی۔ تو ڈولا نے اپنی آنکھیں اُس

کی آنکھوں میں ڈال دیں - دونوں دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے -

"یہ کوئی بات کیوں نہیں کرتے - ؟" میں نے تاراں سے پوچھا -

"شش !" تاراں نے غصے سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا - ڈولا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے لکڑی کے گٹھے کو سنبھالا - اور اُسے آہستہ سے اُٹھا کر نہایت احتیاط سے تورجا کے سر پہ رکھ دیا -

تورجا نے لکڑی کا گٹھا اپنے سر پہ رکھ کر جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا - پھر آہستہ سے بولی "شام کو ملوں گی تنگ کے پیڑ کے نیچے - وہ ڈھلوان والے تنگ پر !"

"بھول نہ جانا "

"نہیں - میں تمہارے لیے مکّا کی روٹی اور مکھن اور کدّو کا ساگ بھی لاؤں گی" اچھا میں چلتی ہوں - کوئی دیکھ لے گا "

"تھوڑی دیر تو ٹھہرو "

"نہیں کوئی دیکھ لے گا " یہ کہہ کر تورجا جلدی سے ندی پار کر کے چلی گئی - ڈولا اس کنارے بیٹھ گیا - اور دیر تک تورجا کو جاتے دیکھتا رہا -

"کوئی دیکھ لیتا تو کیا ہوتا - ؟" میں نے تاراں سے پوچھا - تاراں نے سوچ سوچ کر کہا " شاید وہ لوگ تورجا سے اُس کی گیند چھین لیتے "

ہمیں آئے ہوئے یہاں آٹھ دن ہو گئے تھے - اور اب ہمیں یہ جگہ بالکل اچھی نہیں لگتی تھی - اور بہت پھیلی ہوئی معلوم ہوتی تھی - مگر گزشتہ آٹھ دنوں

میں ہم نے اِس کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا تھا۔ اور اب ہمارے لیے یہ جگہ ہر روز سُکڑتی جا رہی تھی۔ آخر میں بالکل ایک گیند کی طرح چھوٹی سی دکھائی دینے لگی تھی۔ اور میں نے اب طے کر لیا تھا۔ کہ کل پتاجی سے واپس چلنے کے لئے ضد کروں گا۔ اور تاراں بھی میرا ساتھ دے گی۔

گذشتہ دو دن سے سردار کرپال سنگھ مشیر مال بھی آئے تھے۔ وہ کہیں دَورے پر جا رہے تھے۔ اور ہمارے پتاجی کے پاس دو دن کے لیے رُک گئے تھے۔ میرے پتا جی کے اصرار پر یہ دونوں دوست دن بھر شطرنج کھیلتے رہتے تھے۔ اور شطرنج کے شوق میں پتاجی نے ٹراؤٹ مچھلیوں کے شکار کو بھی بُھلا دیا تھا۔

تیسرے روز سردار کرپال سنگھ نے پتاجی سے رخصت چاہی۔ اُن کا سامان بندھ چُکا تھا۔ اور وہ آگے جانے والے تھے اور میرے پتاجی سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ سردی خاصی تھی۔ اور برآمدے کے باہر اُن کے گھوڑے اور خچر ہنہنا رہے تھے۔ اور مزدور لوگ بوجھ اُٹھا رہے تھے۔ کہ اتنے میں ایک اردلی بھاگا بھاگا آیا اور مشیر مال سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"حضور ایک بیگاری کم ہے۔ رات کو ایک بیگاری کسان بھاگ گیا۔"

مشیرِ مال نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ عین اُسی وقت اُن کی نگاہ ڈُولا پر پڑی ڈولا جو ابھی جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا تھا۔ اور برآمدے میں بیٹھا ستا رہا تھا۔

"اسے لے لو" مشیرِ مال نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

ڈولا چونک کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"نہیں حجُور۔ نہیں۔ میں نہیں جاؤنگا۔ مجھے یہاں کام ہے۔"

"کام کا بچہ!" مشیرِ مال کو اِکدم غصہ آگیا۔ انھوں نے زور سے ڈولا کی پیٹھ پر ہنٹر مار کر کہا۔ "اُٹھ سوؤر کا بچہ!"

ڈولا اُٹھتے ہی بھاگ گیا۔ دو اردلی اُس کے پیچھے دوڑے اُسے پکڑ کے لائے۔

مشیرِ مال نے کہا۔ "سالے کے سر پر بھی دو جُوتے مارو!"

ڈولا کے سر پر اور جسم پر اتنے جُوتے مارے گئے، کہ اُس کا جسم نیلا پڑ گیا۔ مگر پھر بھی وہ چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا۔ "میں نہیں جاؤنگا۔ میں نہیں جاؤنگا۔"

"سالا بے گار نہیں دے گا تو یہاں راجہ جی کا راج کیسے رہے گا۔" مشیرِ مال نے گرج کر کہا۔ "رکھو اِس کے سر پر بوجھ اور مارو اس کے چوتڑ پر ہنٹر۔"

دو آدمیوں نے مل کر اُس کے سر پر بوجھ رکھا اور ہنٹر مارتے ہوئے اُسے آگے لے چلے۔ ڈولا مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا جاتا تھا۔ اور روتا جاتا تھا۔

مجھے ڈولا پر بڑا ترس آیا۔ اور جب ڈولا چلا گیا تو مَیں نے پتاجی سے پوچھا۔ چاچا جی ڈولا کو کیوں مار رہے تھے۔؟"

"وہ بے گار نہیں دیتا بیٹا! مگر بے گار تو یہاں ہر کسان کو دینا پڑتی ہے یہ سرکاری قانون ہے۔!"

"قانون کیسا ہوتا ہے۔ پتاجی؟"

"جو راجہ کہہ دیں وہ قانون ہوتا ہے۔" پتاجی نے بڑی بے دلی سے کہا اور گھوم کر کمرے کے اندر چلے گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا اُنھیں مجھ سے بات کرنا پسند نہیں۔

اُسی رات تورجا نیتی کا نیتی چوکیدار کے پاس آئی اور اُس سے پوچھنے لگی۔

"ڈولا کہاں ہے؟"

"یہاں نہیں ہے" چوکیدار نے ایک رسّی بٹتے بٹتے کہا۔ وہ بڑے عمدہ طریقے سے رسّی بنا رہا تھا۔ اور ہم دونوں اُسے دیکھ رہے تھے۔

"کوتے گیّا؟" تورجا نے گوجری زبان میں اُس سے پوچھا۔

"کھوائیں"۔ چوکیدار نے ہاتھ کے اشارے سے شمالی سلسلۂ کوہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کدا اچھس؟ (کب آئے گا) تورجا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کیا معلوم کب آئے۔" چوکیدار رسّی کو بل دیتے ہوئے بولا۔

"دس دن بعد آئے گا۔ بیس دن بعد آئے گا۔ سرکاری بے گار پر گیا ہے۔ جب مالک چھوڑیں گے آئے گا۔"

تورجا دھم سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اور رونے لگی۔

چوکیدار دیر تک رسّی بٹتا رہا اُس کا چہرہ تند اور خشمگیں تھا۔ مگر وہ مُنہ سے کچھ نہ بولا۔

دیر تک تورجا روتی رہی۔ آخر بولی۔

" ہم بکروال لوگ اِس ڈھاکے کو چھوڑ کر کل جا رہے ہیں!"

چوکیدار کچھ نہیں بولا۔

"مجھے بھی اُن کے ساتھ جانا پڑے گا۔ لیکن اگر ڈولا یہاں ہوتا۔۔۔۔"

چوکیدار پھر بھی کچھ نہ بولا۔

نُورجا وہاں سے اُٹھ گئی۔ اور ندی کے کنارے جا بیٹھی۔ دیر تک بیٹھی بیٹھی ہماری گیند سے کھیلتی رہی۔ وہ کھیلتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد اُس نے گیند کو سینے سے لگا کر زور سے پانی کی سطح پر پھینک دیا۔

ندی کی لہروں پر ٹکراتی ہوئی گیند دُور تک بہتی چلی گئی اور جب تک وہ گیند اُسے نظر آتی رہی۔ نُورجا ٹکٹکی باندھے اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ اور جب گیند نظروں سے غائب ہوگئی تو وہ اِک آہ بھر کر وہاں سے اُٹھی اور بھاگتی ہوئی بکروالوں کے خیموں کی طرف غائب ہوگئی۔

رات کو پتا جی خلافِ معمول بہت چُپ چُپ سے تھے۔ ہم نے اُن سے کہانی کی فرمائش کی۔ مگر انھوں نے ہمیں کہانی بھی نہیں سُنائی۔ کہنے لگے۔

"آج جلدی سے سو جاؤ۔ صبح ہم لوگ واپس چلیں گے۔"

۳

پہاڑوں میں گرمی کی دوپہریں بڑی صاف شفاف اور اُجلی ہوتی ہیں۔ ایسی دوپہروں میں پتا جی کی عادت تھی کہ وہ کھانا کھا کے قیلولہ کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ماں جی ایک ہاتھ سے پنکھا جھلتیں اور دوسرے ہاتھ سے آہستہ آہستہ اُن کے پاؤں دباتیں۔ حتیٰ کہ اُنھیں نیند آجاتی۔ بیچ بیچ میں مجھے بھی وہ سختی سے سو جانے کے لیے کہتیں۔ اور میں بھی اُن کے کہنے پر اپنی آنکھیں ادھ مُندی کر کے سونے کی کوشش کرتا۔ حتیٰ کہ میرے پپوٹے دُکھنے لگتے۔ کبھی تو مجھے نیند آجاتی اور کبھی میں ماں جی کو پائنتی پر اُونگھتا ہوا چھوڑ کر چپکے سے باہر باغ میں نکل جاتا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بڑی عمر کے لوگ دن میں کیوں سوتے ہیں۔ جب وہ رات میں سوتے ہیں تو پھر دن میں

کیوں سوتے ہیں۔؟

ایک ایسی ہی اُجلی صاف شفاف دوپہر میں مَیں ماں جی کی نظر بچا کر بنگلے سے باہر نکل آیا۔ اور مالی کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اُس دن شاید گرمی کچھ زیادہ تھی۔ اس لیے باغ کے پھول بھی نڈھال سے معلوم ہوتے تھے۔ اور اُن پر کوئی تیتری بھی نہ تھی جسے میں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ مالی کا کُتا گھر کے باہر سویا ہُوا تھا اور گھر کے اندر مالی بھی سویا ہُوا تھا۔

کس سے کھیلا جائے؟ کیسے کھیلا جائے؟ یہ سوال ایک بچے کی زندگی میں اسی قدر اہم ہیں۔ جس قدر بڑوں کی زندگی میں یہ سوال کہ کام کیسے حاصل کیا جائے اور میں اپنی چھوٹی سی عمر کے اُس مقام پر پہنچ کر رُدہان سا ہو رہا تھا۔ اتنی خوبصورت دوپہر تھی اور لوگ سو رہے تھے۔ اور میرے ساتھ کوئی کھیلنے والا نہ تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے یہ دن کو سونے والے لوگ سورج کی، کھلے آسمان کی اور پور پور شاداب دھرتی کی بے عزتی کر رہے ہوں۔ ایسا خوبصورت وقت کب آئے گا، جب دُور کے نیلے پہاڑوں سے آنے والی شگفتہ ہوائیں مچل مچل کر انسان کے جسم کو گدگدانے کے لیے بے تاب ہوں اور انسان سوتا رہے۔ ہم لوگ جب تک بچے رہتے ہیں۔ پھٹے کپڑے پہن کر اور سوکھی روٹی کھا کر بھی ہنستے کھیلتے رہتے ہیں۔ اور دُنیا کو اپنے بے فکر قہقہوں سے معمور کر دیتے ہیں۔ مگر بڑے ہو کر اکدم کھیلنا بھول جاتے ہیں اور بھرے پیٹ بھی سوُر کا سا منہ لیے گھومتے ہیں۔ جیسے پیٹ میں روٹی نہ ہو۔ لوہے کی کیلیں پڑی ہوں۔ اپنے بچپن میں مَیں اِس تضاد پر اکثر حیران ہُوا کرتا تھا۔ اب حیران

تو نہیں ہوتا ہوں۔ اتنا ضرور جانتا ہوں۔ کہ انسان کی آدھی تکلیفیں تو بھوک سے پیدا ہوتی ہیں اور آدھی اِس بات سے کہ انسان کھیلنا بھول گئے ہیں!

سارے باغ کا چکر کاٹ کر پریشان اور اُداس ہو کر میں اپنے باغ کے چناروں کے نیچے جا کھڑا ہُوا اور اس بلندی سے نیچے پھسلتی ہوئی گھاٹی کو دیکھنے لگا۔ گھاٹی کے درمیان دو شہتوت کے پیڑ اکٹھے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے۔ اُن کے سائے میں بھیڑیں آرام کر رہی تھیں اور چرواہا تنے سے ٹیک لگائے ایک بکرو ٹے کو اپنی گود میں لیے سو گیا تھا۔ گھاٹی سے نیچے اُتر کر کھیت نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹی سی بھوری پگ ڈنڈی کسی مسافر کے قدموں سے ناآشنا اکیلی ندی کی جانب چلی جا رہی تھی۔ میری نظر نے آخر تک اُس پگ ڈنڈی کا تعاقب کیا۔ جہاں پگ ڈنڈی پہاڑی ندی کے پانیوں میں رل جاتی تھی۔

جہاں پگ ڈنڈی ختم ہوتی تھی وہاں پر ندی کئی فٹ نیچے اُتر کر ایک ڈھلوان کی صورت میں بہتی تھی۔ اسی ڈھلوان کے اونچے سرے پر لوگوں نے پتھروں کا ایک بندھ باندھا تھا۔ جو ہر برسات میں بہہ جاتا تھا۔ لیکن گرمی اور سردی کے موسم میں قائم رہتا تھا۔ پتھروں کے اس بڑے بندھ پر سے گھوڑوں اور خچروں کے گزرنے کا راستہ تھا۔ مسافر بھی اسی راستے سے گزرتے تھے۔ اور چرواہے ندی کے پار اُونچے جنگلوں سے اپنے گلّے لاتے ہوئے شام کے وقت اسی بندھ سے واپس آتے تھے۔ گیت گاتے ہوئے چرواہے۔ ٹن ٹن جانوروں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں دُور تک اُن

کے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے قدموں کا سنہری غبار اور آسمان پر خوبانیوں کے رنگ ایسی بدلیاں جو شفق کا لمس پاتے ہی شرم سے یوں لال ہو جاتی ہیں جیسے کوئی الھڑ کنواری کسی انجانے مرد کے تصور سے سرخ سرخ ہو جاتی ہے . . . . . .

اس بندھ سے ندی کے دونوں طرف ڈھلوانوں کے اوپر اور نیچے ندی کے پانیوں میں دو چھوٹی چھوٹی جھیلیں سی بن گئی تھیں۔ جسے ہم پہاڑی زبان میں 'ڈاب' کہتے ہیں۔ بندھ سے اوپر والی ڈاب ڈونگی ڈاب کہلاتی تھی۔ کیونکہ اس میں پانی زیادہ ہوتا تھا۔ اور وہ اوپر کی ڈاب سے گہری اور زیادہ خطرناک سمجھی جاتی تھی۔ پتیلی ڈاب میں عورتیں نہاتی تھیں اور ڈونگی ڈاب میں مرد نہاتے تھے۔ اور بیچ میں اونچا بندھ تھا۔ اور گو کسی نے کسی کو منع نہیں کر رکھا تھا۔ اور کوئی قانون اس امر کے بارے میں موجود نہ تھا۔ لیکن یہ بالکل طے تھا۔ کہ کوئی مرد بھولے سے بھی پتیلی ڈاب میں نہیں نہائے گا۔ اور نہ کوئی عورت ڈونگی ڈاب میں نہانے کے لیے جائے گی۔ پتیلی ڈاب عورتوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے تھی اور ڈونگی ڈاب مردوں کے لیے، بیچ میں بندھ دونوں کے لیے ستر پوشی کا کام دیتا تھا۔ بلکہ پتیلی ڈاب کے بیچ میں جو اونچی اونچی چٹانوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ تھا۔ اس کی دراڑوں سے چھپ کر عورتیں تو پھر بھی بندھ سے نیچے ڈھلوان کی ڈاب میں نہاتے ہوئے مردوں کو دیکھ سکتی تھیں۔ لیکن پتیلی ڈاب کا ہر کونا سوائے اونچی چٹانوں کے اس سلسلے کی چوٹی کے مردوں کی نظر سے غائب رہتا تھا۔ اور یہ بات عورتوں کو بہت پسند تھی۔ کیونکہ اس

علاقے کی عورتیں اور مرد ایک وقت کھانا کھاتے ہیں اور ننگے نہاتے ہیں۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ ننگے نہانے میں جو مزا ہے۔ وہ سومنگ کاسٹیوم پہن کر نہانے میں نہیں ہے۔ مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب اپنی ندی کے پانیوں میں ایک چھوٹی سی مچھلی کی طرح تیرا کرتا تھا۔ سبک، بے فکر، خوش خرام اب کسی سومنگ پول کے کنارے ربڑ کا خود اور نائیلان کا خوش رنگ نیکر پہنے سنگ مرمر کے فرش والی پول کے پانیوں میں قدم اتارتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نہانے نہیں جا رہا ہوں۔ کسی پُر تکلف رستوران میں ڈنر کھانے جا رہا ہوں۔

اُس وقت چناروں کے نیچے کھڑے ہو کر جب میری نظر گھاٹی سے پھسلتی ہوئی پگ ڈنڈی پر دوڑتی ہوئی ندی کے کنارے پہنچی تو میرے منہ سے بے اختیار مسرت کی ایک چیخ نکل گئی۔ کیونکہ بند کے دائیں بائیں پتیلی اور ڈونگی دونوں ڈالوں میں لوگ نہا رہے تھے۔ اور اتنی دُور سے میں اُنہیں چھوٹے چھوٹے کھلونوں کی طرح پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اور یکایک مجھے اپنے سارے جسم میں پہلے تو سنسنی اور پھر گرمی سی محسوس ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دوپہر گرم ہے۔ ہوا بند ہے۔ فضا میں گھٹن ہے۔ اور مجھے فوراً نہانے کے لیے ندی پر چل دینا چاہیئے۔ اور یہ خیال آتے ہی مسرت کی دوسری چیخ میرے منہ سے نکلی اور میں دونوں ہاتھ پھیلا کر ڈھلوان پر نیچے دوڑتا ہوا تاراں کے گھر کی طرف اُتر گیا۔ میرے لیے ندی پر نہانا ممنوع تھا۔ ماں جی نے بڑی سختی سے اس کی تاکید کر رکھی تھی۔ مگر اس وقت ماں جی سو رہی تھیں۔ نوکر اونگھ رہے تھے۔ باغ میں سناٹا تھا۔ اور اتنی دُور سے ندی کا نیلا پانی بڑا

بھلا معلوم ہوتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"تاراں کے گھر پہنچ کر جب میں نے اُس کی ماں سے تاراں کے لیے پوچھا تو اُس نے مجھے بڑی سختی سے جھڑک دیا ۔

"تاراں گھر میں نہیں ہے!" وہ بولی ۔

"پھر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا ۔

"مجھے کیا معلوم؟" وہ اُسی کڑوے لہجے میں بولی ۔

اتنے میں میری آواز سن کر تاراں کسی کونے سے باہر نکل آئی اور صحن کے لکڑی کے تھم کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی ۔

"تاراں تو یہ رہی!" میں نے تاراں کی ماں سے کہا ۔

"یہ تو ہے ۔ مگر تمھارے ساتھ نہیں کھیلے گی۔" تاراں کی ماں نے مزید سختی سے کہا ۔

"کیوں نہیں کھیلے گی؟" میں نے پوچھا ۔

"کیونکہ تمھاری ماں بُرا مانتی ہے!" وہ بولی ۔

"ماں مانتی ہے ۔ مگر میں تو نہیں بُرا مانتا! اسے میرے ساتھ کھیلنے کے لیے بھیج دو ۔"

"میں جاؤں گی ۔" تاراں ماں کا دامن کھینچ کر بولی ۔

"تو نہیں جائے گی ۔" تاراں کی ماں نے اُس کے گال پر ایک طمانچہ مارا اور گھسیٹ کر اُسے ایک کونے میں ڈال دیا ۔ جہاں تاراں پڑی پڑی روتی رہی ۔ اور میں تھم سے لگا لگا کئی منٹ تک خاموش کھڑا رہا ۔

آخر یہ لوگ ہمیں کھیلنے کیوں نہیں دیتے ؟ میری ماں اور تاراں کی ماں۔۔۔ ۔۔۔۔ ساری دُنیا کے بچے ایک دوسرے سے کھیلتے ہیں۔ مگر ہم دونوں کے لیے مناہی کیوں ہے۔؟

میں نے تاراں کی ماں سے کہا۔" میں باغ کے پھل نہیں توڑوں گا۔ شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرف نہیں جاؤں گا۔ تنگ کی شاخوں میں کستوریوں کے گھونسلے کے انڈے دکھانے کے لئے تاراں کو نہیں لے جاؤں گا۔ بس ہم لوگ ندی کی ریتیلی ڈاب کے کنارے نہائیں گے"۔ میں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

مگر تاراں کی ماں نے پھر مجھے جھڑک دیا۔" ندی میں نہانے کے لیے تو میں کبھی نہ جانے دوں نہ اسے نہ تجھے۔۔۔۔۔ دیکھ سیدھا سیدھا گھر چلا جا۔ اگر ندی پر گیا تو میں تیری ماں سے شکایت کر دوں گی"۔

"ییئیں! ییئیں! شکایت کردوں گی۔ ایں۔۔۔۔ ایں۔۔۔" میں نے بُرا سا منہ بنا کر تاراں کی ماں کا منہ چڑایا۔ وہ مجھے مارنے کے لیے دوڑی۔ میں فوراً وہاں سے بھاگ کر نیچے کھیتوں کی طرف سرپٹ دوڑنے لگا۔ تھوڑی دیر تک اُس نے میرا تعاقب کیا۔ پھر وہ ہانپنے لگی۔ اور مجھے گالیاں دیتی ہوئی اپنے گھر کو لوٹ گئی۔

مگر میں دوڑتا ہی چلا گیا۔ میں نے اپنے سے بڑی عمر کے ایک آدمی کا منہ چڑا دیا تھا۔ اور اس امر کی مجھے بڑی خوشی تھی۔ اس لیے میں خوشی سے چیختا ہوا گھاٹی اُتر گیا۔ گھاٹی اتر کر پگ ڈنڈی پر دوڑتا گیا۔ اور اُس وقت تک نہ رُکا

جب تک ندی کا بندھ نہ آگیا۔ پہلے تو میں ڈونگی ڈاب پر گیا۔ وہاں گاؤں کے بہت سے نوجوان تیر رہے تھے۔ اُن میں ہمارے علاقے کا سب سے خوبصورت نوجوان صمدو تھا۔ اور اُس کا بھائی یوسف تھا۔ کانا حمیدا تھا اور موٹا مکی تھا سندر گھراٹیا تھا۔ جو پن چکی چلاتا تھا۔ سردار سنگھ سُنار تھا۔ اور ایک ہاتھ والا ڈُلا تھا جو ایک ہاتھ نہ ہوتے پر بھی بڑی اچھی طرح سے تیر سکتا تھا۔ پھر کاشر بٹ تھا۔ جس کا بھائی ایک مشہور ڈاکو تھا اور جیل میں تھا۔ پھر وہاں پر دِتا چمار تھا۔ جلال چیرواہا تھا۔ منگو براہمن تھا۔ مصر پنڈت تھا۔ اور دو تین ایسے کسانوں کے لونڈے تھے جن کے نام میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن جن کی صورتیں پہچانتا تھا۔ اور وہ سب لوگ نہا رہے تھے اور خوشی کی دھو میں مچا رہے تھے چند نوجوان لال رنگ کے ایک سُوکھے کدّو کو لیے واٹر پولو کی قسم کا ایک کھیل کھیل رہے تھے مجھے دیکھتے ہی وہ لوگ خوشی سے چلائے

"ارے وہ آگیا ڈاکٹر کا حرامی!" سردار سنگھ سُندر بولا۔

"اسے یہاں سے بھگا دو۔ ورنہ اس کی ماں ہماری جان لے لیگی۔ بھاگ جا بے اپنے باپ کے بنگلے میں!"

"ارے نہیں" کاشر بٹ بولا "ارے یہاں ڈاب کے اندر بُلا کر دو چار غوطے دو"

"اکیلا گھوم رہا ہے" ایک ہاتھ والا ڈُلا بولا "اس کی ماں دوسرا ابھی نہیں جنتی۔ جس کے ساتھ یہ کھیلے!"

"ارے نہیں! صمدو ہنس کر بولا" بڑا ہو کر یہ لونڈا بڑا شوقین مزاج

نکلے گا، جب دیکھو۔ اُس بھیانک چمارن کی بیٹی تاراں کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے!"

"کیوں بے تیری ماں کہاں ہے!" سندر گھراٹیا پانی میں تیرتے تیرتے مجھ سے پوچھنے لگا۔

"وہ سو رہی ہے!" میں نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"تو اُسے میرے پاس بھیجدے!" سندر گھراٹیا تیرتے تیرتے ہوا میں اُچھلا اور مجھے اپنا ننگا بدن دکھاتے ہوئے پھر پانی میں ڈبکی لگا گیا۔

سب نوجوان ہنسنے لگے۔

یکایک کانا حمیدا سنجیدہ ہو گیا۔ میری طرف پانی پھینکتے ہوئے بولا "جا بھاگ جا یہاں سے ..... اور اگر تجھے نہانا ہی ہے تو اُوپر کی پتیلی ڈاب میں عورتوں کے سنگ نہالے۔ یہاں کھڑا کھڑا ہماری گالیاں کیوں سُنتا ہے!"

میں اکثر اُن لوگوں کی گالیاں سُنتا تھا۔ بڑی خوفناک گالیاں ہوتی تھیں۔ وہ جنھیں سُن کر مجھے بچپن ہی سے اُن لوگوں کی دبی نفرت کا اندازہ ہو چلا تھا جو ان لوگوں کو آفیسر لوگوں سے تھی۔ یا اُن لوگوں سے جو راجہ جی کی طرف سے اُن پر حکومت کرتے تھے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ لوگ مجھے میرے باپ کے ساتھ کہیں دیکھتے تو سر جُھکا کر میرے باپ کو سلام کرتے تھے اور مجھے چھوٹا ڈاکٹر صاحب کہہ کر اپنے کندھے پر بٹھا لیتے تھے۔ مگر یہ کندھا تو صرف بیرونی دباؤ سے دیتا تھا۔ اندر کا دل تو ہمیشہ نفرت سے اُبلتا تھا۔ میری ماں نہ جانتی تھی۔ میرے باپ کو بھی شاید اس حد تک علم نہ تھا۔ مگر مجھے چھوٹی سی عمر ہی میں ان لوگوں نے محسوس کرا دیا تھا۔ یہ لوگ اپنی عورتوں اور لڑکیوں کے بارے میں ایک

بھی گندہ لفظ نہیں استعمال کرتے تھے۔ مگر ہماری ماؤں اور عورتوں کے لیے ان کی لغت میں کوئی شریف لفظ نہ تھا۔

پانی کے چھینٹے اُڑتے دیکھ کر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہُوا۔ اور پتیلی ڈاب کی طرف چلا گیا۔ تُنگ کے پیڑ کے نیچے مجھے تاراں مل گئی۔ شوخ اور مسرور نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ہانپ رہی تھی۔

"تو کب آئی؟"

"ابھی! تمھارے پیچھے پیچھے۔"

"وہ کیسے؟"

ماں جب تمھیں مارنے کے لئے باہر نکلیں۔ میں گھر سے بھاگ آئی۔ اور پچھواڑے کی سنبلوؤں کی جھاڑیوں سے ہوتی ہوئی ڈھلی نیچے اُتر کر یہاں آن پہنچی۔ دیکھ لو۔

میں نے اپنی نیکر اور قمیص اُتارتے ہوئے کہا۔ "چلو نہائیں۔"

تاراں نے بھی اپنی قمیص اور شلوار اُتار دی اور ہم دونوں بچے تنگ دھڑنگ پانی میں کُود گئے۔ مجھے تاراں نے تیرنا سکھا دیا تھا۔ اور گو اب میں اچھی طرح سے تیر سکتا تھا۔ پھر بھی احتیاطاً ہم دونوں کنارے کنارے تیرتے رہے۔ خوش رنگ پتھر جمع کرتے رہے اور کھیلتے رہے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے جسم کا اس قدر احساس نہ تھا۔ کیونکہ ڈاب میں بڑی عمر کی عورتیں بھی نہا رہی تھیں اور تیر رہی تھیں۔ تقریباً سب کی سب جوان عورتیں تھیں اور مجھے اُن کے ننگے جسم، پستانوں، کولھوں، رانوں اور پنڈلیوں پر سے بڑے عجیب معلوم

ہوتے تھے۔ وہ ایسے جسم نہ تھے جیسے مردوں کے ہوتے ہیں۔ یا چھوٹے چھوٹے لڑکوں یا لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ وہ بڑے عجیب اور دلکش سے جسم تھے۔۔۔
تاراں مجھے بتانے لگی۔

"وہ جو گورے پنڈے اور گول چہرے والی ہے نا۔ وہ شاداں ہے۔ وہ ہمارے علاقے کی سب سے خوبصورت لڑکی ہے۔ اُس کی منگنی صمدو سے ہو چکی ہے۔

اور وہ جو لمبے بالوں والی بڑی بڑی آنکھوں والی سانولی سی لڑکی ہے نا وہ نوراں ہے۔ اور وہ صمدو کے چھوٹے بھائی یوسف سے پیار کرتی ہے۔ اور وہ جو چٹے دانتوں والی کھلکھلا کر ہنس رہی ہے وہ گلاب دین ہے اور سندر گھراتیے کی بیوی ہے اور وہ بھاری کولھوں والی موٹے موٹے ہونٹوں والی رجّی (رضیّہ) ہے۔"

"وہ تو بڑی بدصورت ہے!" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"آہستہ بولو۔" تاراں بڑی چالاکی سے بولی۔ "اور اُدھر زیادہ دیر تک گھور کر مت دیکھو۔ ورنہ یہ عورتیں ہمیں یہاں سے نکال دیں گی۔۔۔۔ ہاں یہ رجّی بڑی بدصورت ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوتی۔۔۔۔!"

"کیوں نہیں ہوتی؟" میں نے پُوچھا۔

"میری ماں کہتی تھی، اس کی شادی نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ بڑی بدشکل ہے اور تیس برس کی عمر اس کی ہو گئی۔ مگر کوئی اسے بیاہنے کو تیار نہیں ہے۔"

"میں تو ہمیشہ تم سے شادی کر سکتا ہوں، چاہے تم کتنی ہی بدصورت ہو جاؤ!"

ی بہن ہے اور اگلے بھادوں میں اُس کی شادی وتے چمار سے ہوگی۔"

" تمھیں کیسے معلوم ہے ؟"

" میری ماں بتاتی تھی ۔"

" تیری ماں کو یہ سب کیسے معلوم ہوتا ہے ؟"

" واہ ۔ کیوں نہیں ہوتا ۔ میری ماں سب جانتی ہے ۔ اُس کو یہ تک معلوم ہے کہ کس کے گھر میں کیا پکا ہے !"

میں نے تیرتے تیرتے ڈُبکی لگائی اور ندی کی تہ سے ایک لال رنگ کا پتھر باہر نکال لایا ۔ اُسے دیکھ کر تاراں مچل گئی " یہ میں لُوں گی ' یہ میں لُونگی ! ' وہ چیخی ۔

" میں نہیں دُوں گا ۔"

" میں لوں گی ۔"

" میں نہیں دوں گا ۔" کہتے ہوئے میں پانی سے باہر نکل آیا تاراں بھی پانی سے نکل کر میرے پیچھے پیچھے دوڑنے لگی ۔ ابھی ہم تُنگ کے پیڑ تک پہنچے ہی تھے ۔ کہ پیچھے سے عورتوں کے چلاّنے کی آوازیں سُنائی دینے لگیں ۔

" کانگ آگئی !"

کانگ !

بچاؤ ۔ بچاؤ . . . . کانگ آگئی ۔ کانگ ! کانگ !!! نہانے والی عورتیں خوفزدہ ہو کر چلا رہی تھیں ۔

یکایک ہم نے ایک عجیب نظارہ دیکھا ۔ اور وہ نظارہ دیکھتے ہی ہمارا دل

سہم کر رہ گیا۔ ندی کے پہاڑی موڑ سے ہماری آنکھوں سے اوجھل یکایک طوفانی پانیوں کے ریلے پتیلی ڈاب میں داخل ہو رہے تھے اور ڈاب کا پانی دم بدم چڑھ رہا تھا۔ نہانے والی عورتوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ تیرنا ویرنا سب بھول گئیں۔ اور گھبرا کر ندی کے اس کنارے آنے کے بجائے ندی کے بیچ کی اونچی چٹانوں کے سلسلے پر چڑھنے لگیں۔ جہاں پانی ابھی تک نہ پہنچا تھا۔ وہ چٹانوں پر چڑھ رہی تھیں اور خوف سے چیخ رہی تھیں۔

"کانگ! کانگ!! بچاؤ! بچاؤ!!!

کانگ یعنی باڑھ ندی میں اکثر آتی ہے۔ مگر ہمیشہ بارش کے دنوں میں آتی ہے۔ برسات کے دنوں میں آتی ہے۔ جب بادل اُمڈتے ہیں۔ اور گھنگھور گھٹا کی صورت میں برستے ہیں۔ کانگ سردیوں میں بھی کبھی کبھی آتی ہے۔ جب برف پڑتی ہے۔ یا جب ندی کی وادی میں بارش ہوتی ہے اور دُور ندی کے منبع کے پہاڑوں پر برف پڑتی ہے، اُس وقت بھی کانگ کبھی کبھی آجاتی ہے۔ اور اسی طرح یک لخت آجاتی ہے۔ مگر یہ تو گرمیوں کے دن تھے۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا نہ تھا۔ دُور دُور تک پہاڑوں کی چوٹیوں پر کہیں کوئی لکہ ابر نہ منڈلاتا تھا۔ پھر اس گرم اور خشک اور حدّت کی ماری دوپہر میں یہ کانگ کہاں سے آگئی؟"

ڈاب کے نیلے پانیوں میں کانگ کے گدلے مٹیالے پانی کے طوفانی ریلے فاتحانہ انداز میں شور مچاتے ہوئے گنڈوں اُوپر اُچھل رہے تھے ۔۔۔۔۔۔

شاید ان پہاڑوں سے پرے ہمارے پہاڑوں سے دُور نظر نہ آنے والے پہاڑی سلسلوں میں کہیں کوئی بادل اُمڈا ہوگا۔ کہیں پر وہ جھوم کر برس گیا ہوگا۔ کہیں

پر وہ کسی طوفان کی طرح کسی سوکھے نالے میں گھس کر ہزاروں من بھاری پتھر لڑکھڑاتا ہوُا اس ندی میں میں آملا تھا۔ اور اب کانگ کی صورت میں پھیل کر یکایک موت اور تباہی کے دیو کی طرح دھاڑتا ہوُا اُس اُونچی چٹان کی چوٹی پر کھڑی ہوئی ننگی عورتوں کے گرد گھوم رہا تھا۔

میں اور تاراں کنارے کے تنگ کے پیڑ سے بھی بھاگ کر پرے ایک اونچے ٹیلے پر چلے گئے۔ اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے پانی کے خوفناک بھنور دیکھنے لگے۔

عین اُسی وقت کانگ کا پانی اُوپر اُچھلا اور نیچے کی ڈاب میں آبشار کی صورت گرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں نیچے سے بھی آوازیں آنے لگیں۔ "کانگ! کانگ!! کانگ آگئی!"

پھر چند منٹوں میں وہ سب لوگ پانی سے باہر آ گئے۔ ننگ دھڑنگ۔ اور باہر آتے ہی عورتوں کی چیخیں سن کر پتیلی ڈاب کی طرف دوڑے۔

پتیلی ڈاب میں پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا، بیچ کے چٹانوں کے سلسلے کی صرف آخری اور سب سے اُونچی چوٹی پانی سے اوپر تھی۔ اور اُس پر نہانے والی عورتیں ایک دوسرے کے جسم میں گھسی ہوئی چٹانوں کے کونوں کو اپنے ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے چلا رہی تھیں۔

"کانگ! کانگ! بچاؤ! بچاؤ!"

سب سے پہلے صمدو نے شاداں کی طرف دیکھا۔ اور دیکھتے ہی ایک والہانہ اضطراب سے پانی میں کود پڑا۔ اُس کے بعد یوسف کودا۔

پھر کانا حمیدا۔
پھر سندر گھراٹیا۔

پھر دتا چمار اور مصر پنڈت اور کا شر بٹ بھی پانی میں کود گئے۔ صرف ایک ہاتھ والا گولا بے بس ہو کر پانی کے کنارے کھڑا رہا۔ کیونکہ وہ ایک ہاتھ والا تھا۔
سب سے پہلے صمدو اپنی شاداں کو کنارے پر لے آیا۔ پھر یوسف توراں کو لیکر آیا۔ پھر سندر گھراٹیا اپنی بیوی گلاب دیئی کو بچا لایا۔ پھر کا شر بٹ امتل کو کندھے پر چڑھائے ہوئے بچا لایا۔ پھر کانا حمیدا اور دتا چمار دونوں مل کر حمیدے کی بہن کو بچا کر لے آئے۔ سب لوگ اپنی اپنی بیویوں، بہنوں اور منگیتروں کو بچا کر لے آئے۔ آخر میں صرف رجّی چٹان پر رہ گئی، کیونکہ وہاں کوئی اس کا رشتہ دار نہ تھا۔
اور کوئی اُس کا پیارا نہ تھا۔ اور وہ کسی کی محبوب نہ تھی! اس لیے کون اُسے بچاتا؟
پانی کے ریلے دم بدم بڑھ رہے تھے۔ پانی چٹان کی آخری چوٹی تک پہنچنے والا تھا۔ چٹان کو اپنے سینے سے بھینچ کر اوندھی لیٹی ہوئی رجّی کی پنڈلیاں بھی پانی میں ڈوب چکی تھیں۔ اور وہ بے بس نیم آمرانہ نگاہوں سے کنارے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور کوئی اُس کا نہ تھا
وہ لوگ ابھی ابھی اپنی عورتوں کو نکال کے لائے تھے۔ اور تھکے ہوئے جانوروں کی طرح ہانپ رہے تھے۔ اس وقت سب کی نگاہوں میں ایک عجیب شرمندگی اور مایوسی سی تھی۔ کیونکہ اس وقت ڈاب کے طوفانی پانیوں میں گھسنا موت کے مُنہ میں گھسنے کے برابر تھا۔
یکایک صمدو نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ مگر شاداں نے اُس کا ہاتھ روک لیا

——— "کیا کرتے ہو

بدصورت رجی اپنا خاموش گھٹتا ہُوا چہرہ لیے کنارے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پانی کا گرداب ہوتے ہوتے اُس کے قریب آ آ جارہا تھا۔ یکایک پانی کی ایک اُچھال اُس کے سارے جسم کو تسرابور کرتی ہوئی گزر گئی اور رجّی کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی۔

صمدُو نے شاداں سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دھم سے پانی میں کود گیا۔ طُغیانی پُورے زور پر تھی۔ مگر صمدو کا شباب بھی اپنے عروج پر تھا۔ اور پانی کے پاس کوئی دماغ نہ تھا۔ لیکن صمدو ایک انسان کا ذہن اور دماغ بھی رکھتا تھا۔ اس لیے اس کے جسم کی طاقت نے عقل کا سہارا لے کر پانی پر بالآخر فتح پائی اور ریلوں کو پے درپے کاٹتا ہُوا اُس اونچی چٹان کے کنارے اُس وقت جا پہنچا جب رجّی پانی کے طوفان میں بہہ جاتے کو تھی۔ عین اُسی وقت صمدو نے اُسے اپنی باہوں میں اُچھال لیا ——— چند لمحے تک وہ رجّی کو پکڑے چٹان کے ڈوبے ہوئے کھنے سے لگا پانی کے ریلوں کا رُخ دیکھتا رہا۔

پانی نے یکایک اپنا رُخ کھیتوں کے کنارے کی طرف موڑ دیا تھا۔ یعنی اُس طرف جدھر شاداں، نوراں، امتل، حمید اور تہ چمار اور دوسرے لوگ کھڑے تھے۔ پانی کا سارا زور اب اُس طرف تھا۔

دوسری طرف بیچ کی چٹان کے دوسری جانب پہاڑی کنارے کا فاصلہ بھی کم تھا۔ موت کا خطرہ دونوں طرف تھا۔ مگر پہاڑی کنارے کی جانب کوشش کرنے میں خطرہ کم تھا۔ اور اب صمدو بہت ہانپ چکا تھا۔ مگر وہ مرد تھا اور کوشش

کرنا اُس کا فرض تھا۔

شاداں نے ہاتھ ملتے ہوئے ایک عجیب نگاہ سے صمدو کی طرف دیکھا۔

"ہائے میرا صمدو!" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر رونے لگی۔

رجّی کا سارا جسم پانی میں ڈول رہا تھا۔ مگر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ صمدو کے گلے میں ڈال دیئے تھے۔ اور اب وہ اُس کی پیٹھ سے لگی سسک رہی تھی۔

"گھبراؤ نہیں" صمدو اُسے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

"میں تمھیں بچالوں گا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اُس نے مجھے تم تک پہنچا دیا ہے۔ تو آگے کنارے تک بھی وہی لے جائیگا۔ مگر گھبراؤ نہیں۔ اور میری گردن پر اپنے بازوؤں کی گرفت اتنی تیز نہ کرو کہ میں تیر نہ سکوں۔ ورنہ دونوں مارے جائیں گے۔ سمجھ گئیں؟"

"ہاں!" رجّی نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

صمدو نے ایک اُچھال کا سہارا لیا، اور اس کنارے آنے کے بجائے اُسی کنارے کا راستہ اختیار کیا۔

"ہائے وہ بہا جا رہا ہے!"

اس کنارے سے شاداں چلائی۔

"نہیں۔ وہ دوسرے کنارے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

کانا حمیدا بولا۔ "اُدھر پانی کا زور کم معلوم ہوتا ہے۔"

یہ موت اور زندگی کی کشمکش تھی۔ مگر اس کشمکش میں رجّی نے صمدو کا پورا پورا ساتھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کی گھبراہٹ دُور ہو گئی اور وہ صمدو

کے ساتھ ساتھ پانی کے ریلوں کا پورا پورا مقابلہ کر کے اُس کا ہاتھ بٹانے لگی
دو مرتبہ تو وہ لوگ بھنور میں پھنس گئے۔ مگر ایک بار صمدو نے اور دوسری بار
رجّی نے اپنی مشاقی سے معاملہ سنبھال لیا۔ اور یکایک صمدو نے محسوس کیا کہ رجّی
بہت اچھا تیرنا جانتی ہے۔

"شاباش!"

صمدو نے رجّی کی ہمت بندھائی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں
رجّی اور صمدو ندی کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے جو کھیتوں والے
کنارے سے بہت اُونچا تھا اور پہاڑی گھاٹیوں کے سلسلے سے ملحق
تھا جہاں بڑے بڑے پیڑوں کا ایک گہرا جھنڈ تھا ـــــ

سہ پہر تک کانگ بڑھتی گئی۔

پھر شام ہو گئی کانگ نہ اُتری۔

پھر رات ہو گئی، اور اس کنارے کے لوگ مایوس ہو کر واپس چلے گئے
مگر اب اُن کے دل میں اطمینان تھا۔ کہ اب کانگ رجّی اور صمدو کا کچھ بگاڑ نہیں
سکتی۔ وہ اب دونوں بہت اونچی اور محفوظ جگہ پر تھے۔ اور اگر کانگ رات تک
بھی نہ اُتری تو رجّی اور صمدو دونوں اُس کنارے کے پہاڑ کے کسی گاؤں میں
رات بھر کے لیے پناہ لیں گے۔ اور دوسری صبح کو کانگ اُترتے ہی
واپس آجائیں گے۔

دوسری صبح جب کانگ اُتر گئی، تو شاداں اس کنارے پر پہنچ کر صمدو کا
انتظار کرنے لگی۔ مگر نہ صمدو آیا، نہ رجّی آئی ـــ چند ماہ تک رجّی اور صمدو کا

کچھ پتہ نہ چلا۔

ہاں چند ماہ کے بعد جب صمدو اور رجّی آئے تو دونوں میاں بیوی بن چکے تھے۔اور رجّی کے پیٹ میں ایک بچّہ تھا!

اُس کاتنگ نے نہ صرف علاقے کے کھیتوں میں بلکہ علاقے کے دلوں میں بھی ہلچل سی مچادی تھی۔جب صمدو نے رجّی سے شادی کرلی تو شاداں نے جل کر یوسف سے شادی کرلی۔تو نوراں نے یوسف کی بے وفائی سے گھبراکر کاشر بٹ سے شادی کرلی تو کاشر بٹ کی محبوبہ امتل نمبردار کی بیٹی، دتے چمار کے سنگ بھاگ گئی اور دتے چمار کی منگیتر اور کانے حمیدے کی بہن نے ساٹھ برس کے بڈھے نمبردار سے شادی رچالی . . . . . . پانی کی وہی لہر تھی جو چاروں طرف ہلچل مچائے چلی جارہی تھی۔

اب تو یہ واقعہ ہمارے علاقے میں ایک کہانی کی صورت اختیار کرچکا ہے جب کبھی کوئی عورت میری ماں کے پاس آکر اپنی بیٹی کے طویل کنوارپنے کا دکھڑا لے کر بیٹھتی ہے، تو میری ماں مسکراکر اُس سے کہتی ہے "گھبراؤ نہیں بہنا، تیری بیٹی کے لئے بھی کہیں سے کوئی کانگ آئے گی ضرور . . . . . .!!"

۴

تھانے دار نیاز احمد میرے پتاجی کا بہت دوست تھا۔ دیکھنے میں وہ میرے پتاجی سے بھی خوب صورت تھا۔ میرے پتاجی کی صورت شکل بڑی اچھی اور اُن کا قد بھی پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ اور رنگ بھی گندمی اور سانولے کے درمیان تھا۔ اور وہ ہر ایک سے بڑی نرمی اور مٹھاس سے بات کرتے تھے۔ اور جس سے بات کرتے تھے اُس کا دل موہ لیتے تھے۔

مگر تھانے دار نیاز احمد کی بات اور ہی تھی۔ وہ کچھ اس طرح کا خوبصورت تھا جیسے لوگ تصویروں میں خوب صورت ہوتے ہیں۔ اُونچا پورا قد۔ چھ فٹ تین انچ کا جوان۔ پتلی کمر۔ چوڑا چکلا سینہ۔ دانت سفید۔ اور متناسب۔ چھوٹی چھوٹی بل کھاتی ہوئی مونچھیں۔ چوڑی پیشانی پر کسی پرانے زخم کا داغ تھا۔ جو اُس

کی سپید پیشانی پر ایک مستقل تیوری کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے جب وہ مسکراتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سوچ میں ڈوبا ہوا آدمی مسکرا رہا ہے۔ اُس کی یہ ادا عورتوں کو بہت پسند تھی۔

تھانے دار نیاز احمد اکثر دورے پر رہتا۔ مگر جب دورے سے واپس آتا تو میرے پتاجی سے ملنے کے لیے ہر روز شام کو آتا۔ اُن دنوں میرے پتاجی بہت رات گئے نیچے گھر میں آتے۔ اوپر ہی ہسپتال کے سپیشل وارڈ میں جو اکثر خالی رہتا تھا۔ اور اکثر خالی نہیں رہتا تھا تو خالی کروالیا جاتا تھا۔ وہاں پر میرے پتاجی اور تھانے دار نیاز احمد کی بیٹھک جمتی تھی۔ کیونکہ گھر میں ماں جی کا حکم چلتا تھا۔ اس لیے گھر میں شراب پینے اور گوشت کھانے کی ممانعت تھی۔ اور میرے والد دونوں سے کبھی کبھی شوق فرماتے تھے۔ اس لیے جب تھانیدار نیاز احمد دَورے سے واپس آجاتا تو اُن کے دونوں شوق پورے ہو جاتے تھے۔ دونوں دوست مل کر سپیشل وارڈ میں بیٹھ کر خود مُرغ بھونتے۔ طرح طرح کے مسالے گوشت میں ڈال کر تجربے کرتے۔ باتیں کرتے۔ گاتے۔ بہت رات گئے تک اُن کے قہقہوں کی آوازیں باغ میں آتیں۔ میری ماں کا چہرہ اُس روز فق اور اُڑا اُڑا سا رہتا۔ اور وہ دیر تک برآمدے کے چوبی ستون سے لگی عشق پیچاں کی بیل کے قریب کھڑی میرے پتاجی کا انتظار کیا کرتیں۔ رات کے کوئی گیارہ بارہ بجے کبھی ایک بجے کے قریب۔ میرے پتاجی باغ کے نیلے ٹائیلوں والی روش پر جھومتے جھامتے، گھر آتے ہوئے دکھائی دیتے۔ اور اُن کے لبوں پر یہ گیت ہوتا . . . . .

"پھٹی جیب کان اس بن میں!"

میری ماں کو اس گیت سے بڑی چڑ تھی۔ گیت کیا تھا۔ بس یہی ایک مصرع تھا۔ جسے میرے والد اکثر شراب کے نشے میں اور شراب کے نشے کے باہر بھی جب وہ سوچ میں ہوتے تو گایا کرتے

"پھٹی جیب کان اس بن میں!"

اور میری ماں جھلا کر پوچھتیں۔ آخر اس گیت کا مطلب کیا ہے؟ جب دیکھو اسے گا رہے ہو۔ جب دیکھو۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

بھلی مانس! میرے پتا سکول کے ماسٹر کی طرح ایک انگلی اٹھا کر کہتے۔ اس گیت کا مطلب ہے۔ پھٹی جیب کان اس بن میں۔ یعنی جیب کان اس بن میں پھٹ گئی۔ کان نہیں جانتی ہو؟ کان یعنی لوہے کی کان! نمک کی کان! پتھر کے کوئلے کی کان! کوئی بھی ایک کان جس میں بارود بھر کر اڑایا جاتا ہے۔ کان سے مراد یہ تمہارا کان نہیں ہے۔ جس میں سونے کی بالیاں جھمک رہی ہیں۔ بھگوان کی سوگند جانکی! آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ یہ رنگ روپ تم کہاں سے لائیں؟ تمہاری ماں تو بڑی بدصورت تھیں!

واہ کہاں بدصورت تھیں؟ میری ماں غصّے سے چڑ کر کہتیں۔ ایسی تو خوب صورت تھیں وہ کچھ بھی ہو تمہاری ماں سے اچھی تھیں!۔۔۔۔ اے کاکا۔ تم یہاں کھڑے کیا سُن رہے ہو؟ تم سے دس بار کہا ہے۔۔۔۔ جاؤ۔ بھاگو۔۔۔۔۔۔۔۔ سو جاؤ۔۔۔۔۔۔۔

یہ ابھی تک جاگ رہا ہے! میرے پتا حیران ہو کر میری طرف دیکھ کر

میرے سر کے بالوں سے کھیلتے ہوئے پوچھتے۔

باپ بارہ بجے تک شراب پیئے گا تو بیٹا کیسے سوئے گا؟ میری ماں غصّے سے بھڑک کر اصل مطلب پر آجاتی۔ وہ لڑنا چاہتی تھیں۔ باپ ٹال دینا چاہتے تھے۔ نیاز احمد سے بیٹھک کے بعد ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا۔ مگر اس لڑائی سے پہلے مجھے بستر پر بھیج دیا جاتا تھا۔ پھر دونوں میاں بیوی برآمدے کی کرسیوں پر بیٹھ کر لڑا کرتے تھے۔ یہ اچھی اور عمدہ لڑائی ہوتی تھی۔ کیونکہ میرے والد پی کر بے حد شگفتہ ہو جاتے تھے۔ اور بڑی جی داری سے میری ماں کی باتوں کا جواب دیتے تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے۔ دُور ڈھلوانوں سے پرے ندی کا پانی چاندی کے تار کی طرح چمکتا اور عشق پیچاں کے پھولوں کی مہک سے برآمدہ معطر ہوتا۔ اس لیے اس نتھری نتھری پاکیزہ فضا میں لڑائی بھی بہت عمدہ، ستھری اور سلیقے سے ہوتی تھی۔ شطرنج کے کھیل کی طرح اس لڑائی کے بھی اصول تھے۔ پہلے ماں اونچا بولتی تھیں۔ میرے والد دبتے تھے۔ پھر بیچ میں میرے والد اُونچا بولنے لگتے تھے۔ آخر میں میری ماں روہانسی ہو جاتیں۔ اور دھیرے دھیرے سسکنے لگتیں۔ یہ ایک سگنل تھا کہ اب صلح ہو گی اس کے بعد میرے پتا اپنی آرام کرسی سے اُٹھ کر آتے اور بڑے پیار سے نرمی سے اور بے حد لجاجت سے میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر معافی مانگنے لگتے اس کے بعد میں کچھ نہ دیکھتا۔ خوشی سے لحاف میں دبک کر سو جاتا! ______

جتنے دن نیاز احمد سے بیٹھک رہتی تھی یہی کچھ ہوتا تھا۔

نیاز احمد کی بیوی مر چکی تھی۔ لیکن اُس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔

پہلی شادی سے ایک لڑکا تھا۔ جو بڑے شہر میں پڑھتا تھا۔ نیاز احمد کی عمر پینتیس برس سے کم نہ ہوگی۔ لیکن دیکھنے میں وہ مشکل سے پچیس برس کا دکھائی دیتا تھا۔ وہ بڑا کسرتی جوان تھا۔ اور جب وہ صبح سویرے اپنے قلعہ نما تھانے کی سیڑھیاں اُتر کر گھوڑا دوڑا کر ندی کنارے کسرت کرتا۔ تو صبح کی لطیف سنہری دھوپ میں اُس کا گورا بدن کندن کی طرح چمکتا تھا۔ اور راہ چلتی ہوئی عورتیں سر پر گھڑے رکھے اُسے کنکھیوں سے دیکھتیں جاتیں گھبرا کر نظر جھکا لیتیں۔ پھر دیکھنے پر مجبور ہو جاتیں پھر گھبرا کر نظر جھکا لیتیں اور اک گہری آہ بھر کر اپنے راستے پر چلی جاتیں۔ نیاز احمد کو معلوم تھا کہ اُس پر ایک ہزار ایک لڑکیاں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں قسم کی عورتیں مرتی ہیں۔ اچھے اچھے خاندان والے گھروں سے اُس کے لئے شادی کے پیام آتے تھے۔ مگر وہ شادی نہ کرتا تھا۔ کیوں نہیں کرتا تھا۔ یہ بھی ایک راز تھا جس کا صرف میرے پتا کو علم تھا۔

کچھ عرصے سے نیاز احمد کے معمول میں تبدیلی آچکی تھی۔ پہلے تو وہ لمبے لمبے دورے کیا کرتا تھا۔ اور مہینے میں صرف چار چھ روز کے لیے واپس صدر مقام پر آتا تھا۔ اس لیے چار چھ روز کی بُری صحبت تو میری ماں میرے پتا جی کے لیے کسی نہ کسی طرح رو پیٹ کر گوارا کر لیتی تھیں۔

لیکن اب ایک سال سے یہ ہو رہا تھا۔ کہ نیاز احمد کے دَورے کم ہوتے جا رہے تھے۔ پہلے وہ مہینے میں صرف چار چھ روز کے لیے آتا تھا۔ اب وہ آٹھ دس روز کے لیے صدر میں ٹھہرنے لگا۔ پھر بارہ پندرہ روز کے لیے۔

پھر بس روز کے لیے قیام کرنے لگا۔ اب گذشتہ چار ماہ سے وہ یہیں صدر مقام پر مقیم ہوگیا تھا۔ یہ میری ماں کے لیے بڑی مصیبت کا وقت تھا!

پھر ایک روز رات میں بڑی بھگدڑ مچی فوج نے ہمارے بنگلے کا محاصرہ کرلیا۔ نہ صرف ہمارا بنگلہ۔ بلکہ جہاں جہاں بھی دوسرے آفیسر لوگ رہتے تھے اُن سب کے بنگلے فوج کے گھیرے میں لے لیے گئے۔ اور اُن سب کے گھروں کی تلاشی لی جانے لگی۔ سارے صدر مقام میں جگہ جگہ مشعلیں سی جلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور لوگ گھبرا کر اِدھر اُدھر جا رہے تھے۔ اور پولیس کے دستے گشت کر رہے تھے۔ اور مختلف مکانوں کی تلاشیاں لے رہے تھے۔ جہاں جہاں اُنھیں کوئی کسی قسم کا شبہ تھا۔

پوچھنے سے معلوم ہُوا کہ راجہ جی نے تھانے دار نیاز احمد کی گرفتاری کے احکام جاری کئے ہیں۔ اور انعام بھی رکھا ہے۔ جو کوئی نیاز احمد کو راجہ جی کے سامنے زندہ یا مُردہ پیش کرے گا اُسے دس ہزار روپے کا انعام دیا جائیگا۔ اسی سلسلے میں وزیر سے لے کر ڈاکٹر تک ہر بڑے آفیسر کے مکان کی تلاشی بھی لی جا رہی تھی۔ کیونکہ تھانیدار نیاز احمد آفیسروں میں بہت مقبول تھا۔ پولیس نے راتوں رات تمام بنگلے چپّہ چپّہ چھان ڈالے۔ مگر نیاز احمد کا کہیں پتہ نہ چلا۔

فوج کے چلے جانے کے بعد دیر تک میری ماں اور باپ بستروں پر پڑے کھُسر پھُسر کرتے رہے۔ اُن کے خیال کے مطابق میں سو رہا تھا۔ پھر بھی معاملہ اس قدر اہم تھا کہ وہ لوگ بہت دھیرے سُروں میں باتیں کر رہے تھے۔ دراصل قصّہ یہ تھا۔ کہ نیاز احمد ہمارے ہی گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ میری ماں نے اُسے اپنے خاص

کمرے میں یعنی پوجا کے کمرے میں رام اور سیتا کی مورتی کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ فوج کے لوگوں نے گو پوجا کا کمرہ بھی کھلوا کے دیکھا تھا۔ مگر وہ لوگ کمرے کے اندر نہیں گئے تھے۔ دروازے سے اندر جھانک کر ہی سرسری نظر سے دیکھ کر چلے گئے تھے۔ کیونکہ وہ پوجا کا کمرہ تھا۔ اور سب لوگ میری ماں کے سخت مزاج سے واقف تھے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ میری ماں اپنے دھرم کے اصولوں کی کتنی سختی سے پابندی کرتی ہیں۔ اس لیے انھیں اس بات کا شبہ تک نہ ہو سکتا تھا کہ میری ماں ایک مسلمان کو اپنے پوجا کے کمرے میں گھسنے دیں گی اور اسے اپنے مقدس اشٹ دیو کی مورتی کے پیچھے چھپا دیں گی۔

اور میری ماں واقعی یہ کبھی نہ کرتیں، اگر میرے پتا لڑ جھگڑ کر میری ماں کو اس کے لیے مجبور نہ کر دیتے۔ میری ماں تو جب بھی اسے نہ مانتیں۔ لیکن میرے باپ نے غصے میں آکر ندی میں ڈوب جانے کی دھمکی دی تھی۔ اس پر میری ماں راضی ہو گئیں۔ مگر فوج کے جانے کے بعد وہ پھر دھیرے دھیرے میرے باپ سے جھگڑنے لگیں۔

"میں تم سے کہے دیتی ہوں اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ تم اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے!"

"اور وہ جو بے چارہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا؟ اس کا کچھ خیال نہیں ہے؟"

"جیسے اس کے کرتوت ویسا وہ پھل پائے گا؟ کیوں اس نے ایسا کیا؟"

"اس نے کہا کچھ کیا تھا۔ جب راجہ کی بہن ہی اس پر عاشق ہو گئی تو

وہ کیا کرتا؟"

"کیا کرتا؟" میری ماں غصّے سے بولیں "اُسے منع کر دیتا۔ راجہ راجہ ہے ملازم ملازم ہے۔ پھر وہ ہندو وہ مسلمان!۔۔۔۔۔ اُس کا پریم کبھی اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے دونوں کا دھرم بھرشٹ ہوتا ہے!"

"محبّت دھرم نہیں دیکھتی ہے!"

"تم تو ناستک ہو۔ میں سمجھی تھی۔ تم آریہ سماجی ہو۔ تم ایک مسلمان کو تو اپنے گھر میں پناہ نہ دو گے! مگر تم آریہ سماجیوں سے کبھی گئے گذرے ہو تم تو ٹھیٹ ناستک ہو!"

"دوستی بھی تو کوئی چیز ہے!"

"اور دھرم کوئی چیز نہیں ہے۔ اپنے مذہب کا تمھیں کوئی خیال نہیں ہے اُس کی یہ ہمت کہ تمھارے راجہ کی بہن سے پیار کرتے چلا ہے۔ اور تمھاری یہ غیرت کہ اُسے گھر میں پناہ دے رہے ہو؟"

"جانکی!" میرے باپ نے اپنے بستر سے اُٹھ کر زور سے میری ماں کی بانہہ پکڑ لی۔ اور اُسے سمجھاتے ہوئے بولے "تم نہیں جانتی ہو دوستی بھی تو ایک دھرم ہے۔ وہ خود ایک مذہب ہے اُس کے اپنے اصول ہیں۔ جس طرح تمھارے دھرم کے اصول ہیں!"

میری ماں نے اپنی بانہہ چھڑاتے ہوئے کہا "ہوں گے! مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اپنے دھرم کے اصولوں کو میرے دھرم کے اصولوں پر لادو۔ جس مندر میں میں تمھیں اشنان کئے بغیر نہیں جانے دیتی تھی۔ اُس مندر

ہیں مَیں نے تمہارے مسلمان دوست کو چھپا لیا ہے۔ نہ جانے بھگوان مجھے اس کی کیا سزا دیں گے۔ کیونکہ میں نے اُن کا مندر بھرشٹ کر دیا ہے۔ زندگی میں جو کام مَیں نے کبھی نہیں کیا تھا تم نے وہ بھی مجھ سے کروا لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میری ماں رونے لگیں ۔

" پتا جی اُسے دلاسا دینے لگے ۔ چند دنوں کی بات ہے اس کے بعد جب سعاملہ ذرا ٹھنڈا پڑے گا ۔ پولیس اور فوج کی دوڑ دھوپ کم ہوگی۔ تو وہ خود ہی ہمارا گھر چھوڑ دے گا۔ اور اس علاقے سے بھاگ جائے گا۔ یہاں رہ کر اُس کی جان کو بھی تو خطرہ ہے !"

"اُس کی جان ہی کو نہیں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہے ؟ یہ مت بھولو کہ تم بھی راجہ جی کے ملازم ہو۔ اور ملازم ہوتے ہوئے دربردہ اُن سے غداری کر رہے ہو۔ مَیں اب تم سے زیادہ نہیں کہتی۔ بس اِتنا کہتی ہوں اپنے دوست سے کہہ دو سنکرات سے پہلے وہ یہاں سے اپنا مُنہ کالا کر جائے ۔ ۔ ۔ ۔ سنکرات کے روز میں اس مندر کو اپنے ہاتھوں سے گنگا جل سے دھو کر صاف کروں گی اور مشرجی کو بلا کر اکیس دن کی کتھا رکھوں گی ۔ یگ کروں گی ۔ ہون کروں گی ۔ پرائچت کا بھوگ اکیس براہمنوں کو کھلاؤں گی تب جا کے کہیں میرے دل کو چین آئے گا !"

دوسرے کمرے میں کچھ آہٹ سی ہوئی ۔ میرے پتا جی نے گھبرا کر کہا ۔ "آہستہ بولو کہیں وہ سُن نہ لے ۔"

" سن لے تو اچھا ہے !" ماں اور بھی جھلّا کے بلند آواز میں بولیں

ششش کہہ کر میرے پتا جی نے میری ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر انھوں نے پھونک مار کر لیمپ بجھا دیا۔

ساتھ والے کمرے میں جو پوجا کا کمرہ تھا جس میں نیاز احمد کو چھپایا گیا تھا۔ اُس کمرے میں پھر ذرا سی آہٹ ہوئی۔ پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ ان دونوں کمروں کے درمیان کا دروازہ دوسری طرف بند تھا۔ روشندان ذرا سا کھلا تھا۔ پتا جی نے ماں سے کہا۔

"کل صبح اس روشندان کے کانچ پر سیاہی پھیر کر اسے بھی بند کرا دینا۔"

"بہت اچھا!" میری ماں نے سرگوشی میں کہا۔ پھر وہ سونے سے پہلے منہ ہی منہ میں کوئی جاپ کرنے لگیں۔ یہ اُن کا روز کا قاعدہ تھا۔۔۔۔۔

دوسرے دن میری ماں سب سے پہلے صبح میں اُٹھ گئیں۔ ابھی نوکر لوگ سوئے پڑے تھے۔ کہ اُنھوں نے نیاز احمد کے لیے چائے اور ناشتے کا سامان تیار کر لیا۔ اور سب کچھ ایک ٹرے میں سجا کر پوجا کے کمرے میں لے گئیں۔ مگر پھر فوراً ہی لوٹ آئیں۔ جلدی جلدی بیڈ روم میں آکر اُنھوں نے میرے والد کو جگایا اور اُن سے کچھ کہا۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ میرے والد جلدی بستر سے باہر نکلے اور پائجامے کا ازار بند اُڑستے ہوئے بولے۔ "کدھر؟ کہاں؟ کیسے؟"

میری ماں بولیں "تم خود چل کے دیکھ لو۔"

پتا جی بھاگے بھاگے پوجا کے کمرے میں گئے۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ پوجا کے کمرے میں نیاز احمد کہیں نہ تھا۔ کمرے کے عقب کی ایک کھڑکی کھلی تھی رات

کی تاریکی میں وہ کھڑکی کھول کر کہیں فرار ہو گیا تھا . . . . .

"اُسی دن صبح آٹھ بجے کے قریب قلعہ نما تھانے کی سیڑھیوں کے نیچے کچی سڑک پر جو ندی کو جاتی تھی نیاز احمد کی لاش پائی گئی۔ کسی نے اُسے مار کر اُس کی لاش کے چار ٹکڑے کر دیئے تھے۔ اور کوئی زندہ یا مردہ اُس کی گرفتاری کا انعام لینے کے لیے بھی نہ آیا تھا۔

میرے پتا اُس وقت نہا دھو کر کپڑے بدل کر ناشتہ کر رہے تھے۔ جب ہسپتال کے اردلی نے اُنھیں آکر اطلاع دی۔ کہ تھانیدار نیاز احمد کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لاش گھر میں آچکی ہے۔ پتا جی نے گھور کر غضبناک نظروں سے میری ماں کی طرف دیکھا۔ اور ماں نے خائف اور پشیمان ہو کر اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ پتا جی ناشتہ کھائے بغیر کمرے سے باہر نکل گئے اور ماں کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ گر کر فرش پر ٹوٹ گیا۔ اور وہ کرسی پر جھک کر رونے لگیں۔

دو دن تک تو میرے پتا جی نے کھانا نہیں کھایا اور کئی دن تک اُنھوں نے میری ماں سے بات نہیں کی۔ پھر سنکرانت آگئی۔ اور میں حسب سابق ست ناجے میں تُلا۔ اور میری کوری دھوتی مشرجی کو دے دی گئی۔ اور ماں مجھے گوردوارے کے باہر کے مندر میں لے گئی ہم نے گھنٹے بجائے۔ اور پھر ہم وہاں سے شاہ مراد کے مزار کی طرف چل دیئے . . . . لیکن آج میری ماں بہت اُداس تھیں۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نجانے کیا خیال کر کے آبدیدہ ہو جاتی تھیں!

جب ہم ڈھکی اُتر کر شاہ مراد کے مزار کے قریب پہنچے۔ تو کیا دیکھا۔ کہ

مزار کے قریب کی سنسان پگڈنڈی پر شاہی محل کی ایک پالکی رکھی ہے۔ اور اُس کے گرد چار کہار کھڑے ہیں۔

میری ماں شاہی ڈولی کو دیکھ کر وہیں ٹھٹھک گئیں۔ وہ مجھے لے کر بجھری کے ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئیں۔ اور دیر تک چُپ چاپ کھڑی رہیں۔ آخر اُنھوں نے مجھ سے سرگوشی میں "تو بچہ ہے۔ تجھے شاہی محل کے کہار جانے دیں گے۔ جا کے دیکھ تو سہی۔ مزار پر کیا ہو رہا ہے؟"

ماں وہیں بجھری کے درخت کی اوٹ میں چھپی کھڑی رہیں۔ مَیں اُن کے اجازت دیتے ہی بگٹٹ بھاگا۔ اور پاؤں سے کنکر اُڑاتا پتھروں کو ٹھوکریں مارتا ہُوا مزار کی طرف دوڑتا ہُوا چلا گیا۔ جدھر گھنی بیریوں کا جھاڑ تھا۔ کہاروں نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن جرّے نے مجھے دُور سے دیکھ لیا۔ اور اُس نے مجھے دیکھتے ہی اشارے سے وہیں رُک جانے کو کہا۔ مَیں وہیں ایک جھاڑی کے قریب دبک گیا۔ میں نے سمجھا یہ بھی جرّے کا کوئی نیا کھیل ہے۔ چپکے سے جرّا میرے پاس آکر آہستہ سے بولا۔

"مزار پر کوئی نہیں جا سکتا اِس وقت!"

"کیوں؟" میں نے دھیرے سے پُوچھا۔

جرّے نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اتنا کہا۔

"مگر میں تم کو لے چلوں گا۔"

"کیسے؟" میں نے پھر پُوچھا۔

مگر جرّے نے پھر میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے ہاتھ سے

پکڑ کر سنتھے کی جھاڑیوں کے پیچھے پیچھے سے گھٹنوں کے بل چل کر دوڑ کر کہیں دبک کر۔ بیریوں کے جھاڑ کے اندر سے آیا۔ وہاں پر ہم دونوں دبک کر بیٹھ گئے اور بیریوں کی شاخیں پرے کر کے دیکھنے لگے۔

چاچا رمضانی مزار کے قریب بیٹھے تھے۔ اُن کے سامنے سفید برقعے میں ایک عورت کھڑی تھی۔ اُس نے اپنا برقع اُلٹا نہیں دیا تھا۔ بلکہ برقع پہنے ہی کھڑی تھی۔

"شاہی محل کی رانی ہوگی!" میں نے دھیرے سے کہا۔ اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں برقع صرف مسلمان عورتیں ہی پہنتی ہیں اور وہ بھی کالا برقع پہنتی ہیں۔ سفید برقع صرف شاہی محل کی ہندو عورتیں پہنتی ہیں۔ اور وہ بھی صرف وہ عورتیں جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں!

چاچا رمضانی کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سفید برقعے والی عورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کا تسبیح والا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

برقعے والی عورت نے تحکمانہ لہجے میں اُس سے کہا "اور تم میری آمد کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے!"

رمضانی نے انکار میں سر ہلایا۔

"اور تم سب نذر نیاز دو گے؟"

رمضانی نے ہاں میں سر ہلایا۔

"اور تم قبر پر روز دیا جلاؤ گے۔ پھول چڑھاؤ گے۔ اور وہ سب کام کرو گے جو اس سلسلے میں کئے جاتے ہیں!"

رمضانی نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

سفید برقع والی عورت دیر تک برقعے کے اندر سے رمضانی کو گھورتی رہی۔ پھر برقعے کے ایک کونے سے دو تین پتلی نازک حسین سی مخروطی انگلیاں پل بھر کے لیے باہر نکلیں۔ اور پھر برقعے میں چھپ گئیں۔ اور سو سو کے کئی نوٹ رمضانی کی جھولی میں گر پڑے!۔

رمضانی جلدی جلدی سے تسبیح پھیرنے لگا۔

"قبر کہاں ہے؟" اُس عورت نے اُسی تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

چاچا رمضانی آنکھ کے ایک کونے سے صرف ایک اشارہ ہی کر سکا۔ مگر اُس عورت نے سب کچھ سمجھ لیا۔ اور وہ بڑے مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی مزار کی سیڑھیاں اُتر کر قبرستان میں چلی گئی۔ جہاں ایک کچی قبر کی طرف چاچا رمضانی نے آنکھ سے اشارہ کیا تھا۔

اب میں اور جبرا بھی منہ موڑ کر اُدھر قبرستان کی طرف دیکھنے لگے۔ جدھر وہ عورت گئی تھی۔

وہ عورت اُس کچی قبر کے قریب جا کر رُک گئی۔ دیر تک وہ وہیں خاموش کھڑی گئی۔

پھر یکایک وہ اُس قبر پر گر پڑی۔ اور اُس کے دونوں ہاتھ قبر پر پھیل گئے۔ اور اُن ہاتھوں کی اُنگلیاں قبر پر اس طرح تڑپنے لگیں جس طرح بہت ہی پتلے پانی میں مچھلیاں تڑپتی ہیں۔

پھر وہ اُنگلیاں بھی ساکت ہو گئیں۔ اور یکایک بیریوں میں گہرا

سناٹا ہوگیا۔ مزار پر اندھیرا سا ہوگیا۔ اور چاچا رمضانی کی تسبیح کے دانے کانپنے لگے۔ اور مَیں اور جبرآ حیرت اور خوف سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

ایک لمبے سکوت کے بعد وہ عورت وہاں سے اُٹھی۔ لیکن اب اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اور اُس کا سفید بُراق بُرقع بھُوری مٹّی میں سَنا ہُوا تھا۔ اور وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی قبر سے پلٹ آئی۔ ہانپتی کانپتی دوڑتی بھاگتی ہوئی وہ جھاڑیوں چٹانوں سے اُلجھتی ہوئی مزار کے اُوپر کی پگ ڈنڈی پر پہنچ گئی۔ اور کسی سے کچھ کہے بغیر اُس پالکی میں بیٹھ گئی۔

کہاروں نے پالکی کا پردہ گرادیا۔ اور ڈولی اُٹھا کر چل دیئے۔ اور چند لمحوں میں ہماری نظر سے غائب ہوگئے!

۵

ڈھکی کے نیچے پولیس کی گڑھی کے نیچے کوئی ایک میل لمبا میدانی قطعہ تھا۔ اور اپنے علاقے کے بچوں کے خیال میں اس لمبا میدان دنیا میں کہیں نہ ہوگا۔ اس میدان میں قریباً ایک سود کانوں کا بازار ہوگا۔ اور اس بازار کے پیچھے دونوں طرف علاقے کے غریب ترین مقامی باشندوں کے گھر تھے۔ اور علاقے کے امیر ترین لوگوں کے گھر بھی اس میں تھے۔ دو منزلہ، سہ منزلہ، پختہ گھر، پتھر کی دیواروں کے گھر، ٹین کی چھتوں کے گھر، گھروں کے درمیان گلیاں، گلیوں میں نکڑ اور ناکے جہاں گندے لڑکے شور مچاتے ہوئے۔ ناک سُڑکتے ہوئے کبڈی کھیلتے تھے۔ یا قاضی کو ٹرا ما شاہ چور ڈاکو۔ ڈھکی کے اوپر سطح مُرتفع پر آفیسر لوگوں کے بنگلے تھے۔ اور ڈھکی کے نیچے میدانی علاقے پر مقامی باشندوں کے گھر تھے

خاص خاص موقعوں کے سوا آفیسر کلاس کے بچوں اور اُن کے گھر والوں کو اِس طرف آنے کی ممانعت تھی۔ اس طرح مقامی باشندوں کے بچے اور عورتیں ڈھکی کی اُونچائی پر بہت کم آتی تھیں۔ گو کسی طرح کا ایسا قانون نہ تھا۔ اور کوئی تحریری ممانعت بھی نہ تھی۔ مگر بس ایک غیر تحریری سا معاہدہ تھا جس کی پابندی دونوں دنیاؤں میں ہوتی تھی۔ ہماری دُنیا الگ تھی۔ اُن کی دنیا الگ تھی۔ دونوں کے درمیان ایک اوپری قسم کی مفاہمت تھی۔ جس کی سطح کے نیچے نفرت کی ایک تیز رو بھی چلتی تھی۔ جس کی وجہ سے آفیسر لوگ مقامی باشندوں پر اعتماد نہ کر سکتے تھے۔ نہ مقامی باشندوں کو آفیسروں پر پُورا بھروسہ تھا۔ یوں بھی نشیب و فراز میں تضاد تو ہو سکتا ہے۔ اعتماد کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک حکم دیتا ہے۔ دوسرا اُس حکم کو برداشت کرتا ہے۔ اس رشتے میں محبت کہاں سے آئے گی۔؟

ڈھکی کے اوپر رہنے والے ڈھکی کے نیچے رہنے والوں کو حقارت کی نگاہ سے اس لیے بھی دیکھتے تھے کہ نیچے والے علاقے میں دن رات مار پیٹ سر کھٹول ہوتی۔ ہر روز دو ایک کیس پولیس کے پاس آجاتے۔ اور پھر زخمی چارپائیوں پر لیے ہوئے ہسپتال پہنچا دیئے جاتے۔ مقامی باشندوں کی لڑائیوں سے آفیسر لوگ بڑے عاجز تھے۔ گو یہ بھی سچ تھا کہ ان ہی لڑائیوں کے طفیل اُن کی حکومت چلتی تھی۔ اور اُن کا ڈنڈا چلتا تھا۔ اور بلندی اور پستی کے درمیان فاصلہ قائم رکھنا کس قدر ضروری اور مشکل بھی ہے اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو خود بلندی پر رہتے ہوں۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ڈھکی کے نیچے رہنے والے لوگوں کے بغیر ڈھکی کے

اوپر رہنے والوں کا گزارہ نہ ہو سکتا تھا۔ ہمارے
باورچی، مالی، خدمت گزار، مُرغی انڈے والے، کپڑے بیچنے والے، کپڑے دھونے والے، نائی۔ موچی، سُنار، لوہار لکڑ ہارے۔ یہ تو سچ ہے کہ اگر ڈھکی کے نیچے رہنے والے لوگ نہ ہوں تو ہمارے گھر میں چولہا تک نہ جلے۔ لیکن یہ ایک ایسی خطرناک حقیقت تھی جسے سارے علاقے میں کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ ہم سمجھتے تھے اور ہمیں سمجھایا جاتا تھا کہ ہماری دنیا بلندی پر قائم ہے۔ اس بلندی میں کتنی پستی ہے اور اس کا سامنا کرنے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔

بچپن میں مجھے اِن تمام باتوں کا اس قدر شدید صریح اور کھلا احساس نہ تھا۔ بہت سی باتیں گڈ مڈ تھیں۔ جنھیں ڈھکی کے اوپر رہنے والے لوگ اپنی باتوں سے اور گڈ مڈ کر دیتے تھے۔ مجھے بار بار بتایا جاتا تھا۔ کہ ڈھکی کے نیچے کے لوگوں سے زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہیں۔ اُن سے دُور رہنا چاہیئے۔ اُن کے علاقے میں نہیں جانا چاہیئے۔ وہ لوگ چور اور بدمعاش ہیں۔ دھوکے باز اور بے ایمان ہیں۔ بڑیت اور نفرت کرنے والے ہیں۔ وہ لوگ جینا نہیں جانتے۔ تہذیب اُنھیں چھو کر نہیں گئی۔ ایسے لوگوں سے ہمارا کیا علاقہ؟

ایک روز گویا سارا ہسپتال زخمیوں سے بھر گیا۔ دس بارہ چار پائیاں زخمیوں سے لدی ہوئی۔ پولیس والوں کی نگرانی میں پہنچیں اور یہ سُنا کر دو چار اور آرہے ہیں۔ ڈھکی کے نیچے رہنے والوں میں بڑی خطرناک لڑائی ہوتی تھی۔ پندرہ بیس زخمی ہوئے تھے۔ جن میں سے دو تو جان کنی کی حالت میں تھے۔

پتاجی اُوپر ہسپتال سے نیچے صرف یہ کہنے آئے تھے۔ میری ماں سے کہ

دیکھو آج کاکے کو اُوپر نہ بھیجنا۔ سارا ہسپتال زخمیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ممکن ہے دو تین اُن میں سے مر مرا جائیں اور اُس کا بچے پر بہت بُرا اثر ہوتا ہے۔

اور میری ماں یہ سُن کر ایک رنگین کہانیوں والی کتاب لے کر میرے پاس بیٹھ گئیں اور مجھے دُور دراز کی تخیلی پریوں والی کہانی سُنانے لگیں لیکن میرا دل تو اُوپر ہسپتال کے زخمیوں میں تھا۔ کیسی لڑائی ہوئی؟ کیوں ہوئی؟ کیسے کیسے وہ جنگجو لوگ ہوں گے۔ پندرہ بیس زخمی لوگوں کے ساتھ میں پچاس ساٹھ دوسرے آدمی بھی آئے ہوں گے۔ شاید ڈھکی کے نیچے کے کچھ بچے بھی ہوں گے۔ اُوپر ہسپتال میں اس قدر گہما گہمی ہے۔ اور یہاں ایک راجے کے بیٹے کو ایک پری نے جادو کے زور سے مینڈک بنا دیا ہے۔ کس کم بخت کو مینڈکوں میں دلچسپی ہے ماں جی کسی طرح میرے قریب سے ہٹیں تو میں اُوپر ہسپتال کو بھاگوں لیکن جب اس میں پندرہ منٹ گزر گئے اور ماں جی کسی طرح نہ ہٹیں اور کہانی لمبی ہوتی گئی تو یکایک میرے پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ اور جب سو ڈا منٹ کھانے پر بھی دُور نہ ہُوا تو ماں جی نے کرپا رام کو بُلا کر کہا "اوپر ہسپتال جا کر ڈاکٹر صاحب سے پیٹ کے درد کی دوا لے آ۔ کاکے کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔"

"میں خود چلا جاتا ہوں" میں نے نہایت نرمی سے مشورہ دیا۔

"نہیں! ماں جی بڑی سختی سے بولیں۔

میں نے کہا "پیٹ میں صرف درد ہی نہیں بلکہ ایک گولا سا بھی معلوم ہوتا ہے"۔

"گولا سا بھی؟" ماں جی ذرا پریشان ہو کر بولیں۔

اور گولے کے اندر ایک ڈھولا سا بجتا ہے۔ گھُوں۔ گھُوں۔ گھُوں۔"

"گومڑے کے اندر ڈھولا؟" ماں جی اور بھی گھبرا گئیں۔

"ہاں اور ڈھومڑے کے اندر ایک پھپھولا سا اُٹھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے پیٹ ابھی پھٹ جائے گا۔" میں نے پیٹ کو زور سے پکڑتے ہوئے کہا۔

ماں جی بالکل گھبرا گئیں "کرم پے تو جلدی سے کاکے کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جا اور جا کے دکھا دے۔ اور کہہ دینا سب کام چھوڑ کر پہلے کاکے کے لیے دوا دے دیں۔"

"جی بہت اچھا" کہہ کر کرپا مجھے ہاتھ سے پکڑ کر لے چلا۔ میرا ایک ہاتھ کرپا کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھا جب تک برآمدے کا کونہ نظر آ رہا میں اسی طرح پیٹ پکڑ کر چلتا رہا۔ لیکن جونہی میں بنگلے کے عقب میں پہنچا میں نے ایک جھٹکا دے کر کرپے سے ہاتھ چھڑا لیا اور سیدھا ہسپتال کا راستہ لیا۔ اور جاتے جاتے کرپے سے کہہ دیا "اگر ماں جی سے کچھ نہیں کہے گا تو دونی دوں گا۔"

کرپے کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ ایک تو وہ بے حد لالچی تھا۔ دوسرے میرے فرضی کام کے سلسلے میں اُسے بھی گھنٹے پون گھنٹے کی چھٹی مل رہی تھی۔ سودا بُرا نہیں تھا۔ وہ اُسے کیوں قبول نہ کرتا؟

میں بھاگتا ہُوا ہسپتال کے قریب پہنچ گیا۔ برآمدے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سارا برآمدہ زخمیوں کی چارپائیوں سے بھرا پڑا تھا۔ بلکہ کچھ چارپائیاں برآمدے کے باہر باغ کے ایک قطعے میں پڑی تھیں۔ اور دوسرے قطعے میں قربان علی سارجنٹ پُورن مل شاہ اور دوسرے بے فکروں کو لڑائی کے قصے

سُنا رہا تھا۔ میں بھی مجمع میں شامل ہو کر اُن کی باتیں سُننے لگا۔

"ہاں کہہ تو رہا ہوں۔ بتا رہا ہوں۔ جھگڑا کوئی آج کا نہیں ہے۔ کل کا نہیں ہے۔ جھگڑا بہت پُرانا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ ایک طرف چودھری خوشی رام کا مکان ہے۔ دوسری طرف ملایالوں کے سردار شہباز خاں کا مکان ہے۔ بیچ میں یہ زمین ہے۔ جس پر دونوں فریق اپنا حق جتاتے ہیں"۔

"مگر دراصل زمین کس کی ہے" کھڑسنگھ سُنار نے پوچھا۔

"اسی کا تو جھگڑا ہے۔ کہہ تو رہا ہوں۔ بتا تو رہا ہوں۔ زمین ہی کا تو جھگڑا ہے۔ تحصیلدار کچھ کہتا ہے۔ گرداور کچھ کہتا ہے۔ پٹواری کچھ بتاتا ہے۔ جو زیادہ رشوت دے دے زمین اُس کی ہو جاتی ہے۔ عارضی طور پر ہی کبھی شہباز خاں کی ہو جاتی ہے۔ کبھی خوشی رام کی۔ مگر انتقال کسی کے نام نہیں ہُوا ہے ابھی تک"۔

"انتقال کیوں نہیں ہُوا اب تک۔؟"

"انتقال ہو جاتا تو زمین کا سارا جھگڑا ہی مٹ جاتا۔ کہہ تو رہا ہوں۔ بتا تو رہا ہوں" قربان علی ایک دانشور فلسفی کی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ایک طرف ملایالوں کا جنگجو سردار شہباز خاں دوسری طرف موہیال برہمنوں کا مکھیا چوہدری خوشی رام نمبردار لٹھیت اور لٹھ مار۔ دونوں امیر طاقت کے نشے میں پُھولے ہوئے۔ ایک کو مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل، دوسرا حاکموں کی حمایت پر نازاں"۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ ملک عطا محمد کیسے بیچ میں آ گیا؟" پُورن مل

شاہ نے پوچھا "جھگڑا تو چودھری خوشی رام اور شہباز خاں کا تھا۔ یہ ملک عطا محمد کیسے بیچ میں آگیا؟"

"کہہ تو رہا ہوں۔ بتا تو رہا ہوں" قربان علی نے مزے مزے سے سگرٹ کا کش لے کر کہا "ایک رات پرمیسر کا نام لے کر چودھری خوشی رام نے متنازعہ زمین پر مکان بنانا شروع کر دیا۔ اور راتوں رات دیوار کھڑی کر دی۔ جسے دوسرے دن اللہ کا نام لے کر شہباز خاں نے گرا ڈالا۔ دوسری رات پھر چودھری خوشی رام نے دیوار بنا دی۔ جسے تیسرے دن پھر شہباز خاں نے گرا دیا۔ پورے بارہ روز سے یہی قصہ چلتا رہا۔ آخر چودھری خوشی رام کے بڑے بیٹے حوالدار آتما رام کو غصہ آگیا۔ وہ ایک مہینے کی چھٹی پر گھر آیا ہوا ہے۔ وہ ایک گنڈاسہ لے کر گھر سے باہر نکل آیا اور لگا شہباز خاں کو مقابلے پر للکارنے۔ اُدھر ملایال بھی سرداروں کا سردار ہے۔ ایک زمانے میں اُس کے بزرگوں نے اس علاقے پر حکومت کی ہے۔ اُسے بھی طیش آگیا۔ اور وہ اپنے خاندان والوں کو لیکر لڑائی کے لیے باہر نکل آیا۔ اُدھر موہیال براہمنا بھی تم جانتے ہو بڑے خونخوار ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو پرسرام کی اولاد کہتے ہیں۔ اور انگریزی سرکار کی فوج میں بھرتی ہو کر بڑا نام پاتے ہیں۔ وہ سب لوگ ہلہ بول کر چودھری خوشی رام کی ٹولی میں شامل ہو گئے۔ اور عین قریب تھا کہ ہندو مسلم فساد شروع ہو جاتا۔ مگر عین وقت پر ملک عطا محمد بیچ میں کود پڑا۔

"مگر ملک عطا محمد کو کیا پڑی تھی۔؟" پورن شاہ نے پھر پوچھا۔

"کہہ تو رہا ہوں۔ بتا تو رہا ہوں۔ ملک عطا محمد اپنے دو بیٹوں خان محمد اور غلام محمد

کو دے کر اور اپنے خاندان والوں کو دے کر بیچ میں آ گیا۔ اُس نے چودھری خوشی رام کو تو پرے ہٹا دیا۔ اور بولا، چودھری تو بیچ میں مت بول۔ یہ لڑائی تو میری ہے اتنا کہہ کر اُس نے چودھری خوشی رام کو تو پرے ہٹا دیا۔ اور شہباز خاں کو للکار کر کہنے لگا۔ اس زمین پر تو خوشی رام کا مکان بنے گا۔ چوری چھپے نہیں دھڑ لے سے بنے گا۔ اگر تجھ میں مقابلہ کرنے کی ہمت ہے تو مونچھ اونچی کر کے سامنے آ جا۔"
اس کے بعد لڑائی کیسے نہ ہوتی۔ یہ سنتے ہی شہباز خاں نے ملک عطا محمد پر چھوی کا وار کیا۔ اور دونوں فریقین میں گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔

"اور پولیس کہاں تھی؟" فتو کمہار نے پوچھا۔

قربان علی سارجنٹ نے غضب ناک نگاہوں سے فتح دین کمہار کی طرف دیکھا۔ اور غصے سے بولا "کہہ تو رہا ہوں۔ بتا تو رہا ہوں۔ میں تو موضع لالو گمر ڈھی میں ایک مفرور مجرم کو پکڑنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر تھانیدار صاحب چک کلاں میں تفتیش پر گئے ہوئے تھے۔ حوالدار نیاز محمد کے پیٹ میں درد تھا۔ اور چار سپاہی چھٹی پر تھے۔ مگر میں نے آتے ہی معاملے کو ہاتھ میں لے لیا۔ اور اب تو تھانیدار صاحب بھی تفتیش ادھوری چھوڑ کر آن پہنچے ہیں ....."

"مگر یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ ملک فتح محمد کو کیا پڑی تھی!"

ملک فتح محمد تو ایسا زخمی ہوا ہے کہ اُس کے اور اُس کے بڑے بیٹے جان محمد کے بچنے کی تو کوئی اُمید ہی نہیں ہے۔ ابھی مجسٹریٹ لال خاں بھی اندر گیا

ہے۔ اور تھانیدار صاحب بھی اندر ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود ہیں۔ غالباً ملک فتح محمد کا بیان ہو رہا ہوگا۔ تب معلوم ہوگا۔ کہ اُسے کیا پڑی تھی۔ کہ پرائے پھڈے میں اپنی ٹانگ اڑا کے اپنی جان کی بازی لگا دی"

یہ کہتا ہُوا سگرٹ کا کش لگاتا ہُوا۔ قربان علی مجمع کو وہیں برآمدے کے باہر چھوڑ کر برآمدے کا زینہ چڑھنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ برآمدے میں بہت بھیڑ تھی۔ مگر لوگوں نے سارجنٹ کو دیکھ کر راستہ دے دیا۔ میں بھی قربان علی کے ساتھ ہسپتال کے اندر چلا گیا۔ حالانکہ دروازے پر پہرہ تھا۔ مگر سب لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ اس لیے کسی نے مجھے نہیں ٹوکا۔ قربان علی آپریشن روم کے اندر چلا گیا۔ میں بھی اُس کی آڑ لے کر اُس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اس لیے کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔

لیکن قربان علی کی اُونچی لمبی ٹانگوں کے بیچ میں سے مَیں نے دیکھا کہ چارپائی پر خان محمد کی لاش پڑی ہے۔ سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی۔ ایک چارپائی پر ملک عطا محمد سخت زخمی حالت میں پڑا ہے۔ اور مجسٹریٹ لال خاں اُس کا بیان قلمبند کر رہا ہے۔ ایک کرسی پر ڈاکٹر صاحب بیٹھے تھے۔ ایک پر تھانیدار صاحب، اُن کے پیچھے چودھری خوشی رام اپنی بڑی پگڑی سنبھالتا ہُوا کھڑا تھا۔

"مگر ملک عطا محمد تم نے دوسروں کی لڑائی میں کیوں دخل دیا۔ زمین کا جھگڑا تو شہباز خاں اور چودھری خوشی رام کے درمیان تھا۔ تم بیچ میں کیوں کود پڑے؟" مجسٹریٹ لال خاں نے پوچھا۔

ملک عطا محمد ہولے ہولے بول رہا تھا جیسے ایک ایک لفظ تول رہا ہو۔

"سرکار کو ۱۹۰۵ء کی پلیگ تو یاد نہ ہوگی۔ سرکار تو ابھی یہاں آئے نہ تھے۔ لیکن جو اُس زمانے کے لوگ یہاں موجود ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ ہمارے علاقے میں اس سے بڑی تباہی کا زمانہ کبھی نہیں آیا۔ ہر روز لوگ درجنوں کبھی سینکڑوں کی تعداد میں مرتے تھے۔ سرکاری بیل گاڑیاں آتی تھیں اور لاشوں کو لاد کر لے جاتی تھیں۔ لوگ علاقے کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ ماں کو بیٹے کی پروا تھی نہ بھائی کو بہن کی۔ ایسی نفسا نفسی تھی۔ اُن دنوں میری عمر مشکل سے بیس سال کی ہوگی گھر میں سب سے پہلے مجھے پلیگ نکلی اور مجھے پلیگ میں مبتلا دیکھتے ہی گھر والے گھر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ میں بخار میں پھنک رہا تھا۔ لیکن کسی نے میری بات نہیں پوچھی۔ کوئی میرے نزدیک نہیں آیا۔ ہائے ہائے کر کے سب لوگ اپنی جان لے کر بھاگے۔ ماں بھی، بھائی بھی، بہن بھی، باپ بھی۔ پل بھر میں گھر خالی ہو گیا۔ میں بھی اُن کے پیچھے یہ کہتا ہُوا بھاگا "ارے ظالمو! کہاں جا رہے ہو۔ مجھے بھی ساتھ لیتے چلو۔ لیکن وہ سب لوگ مجھے دیکھ کر اس طرح بھاگے جیسے میں انسان نہیں بھوت ہوں"

"میں بے ہوش ہو کر دروازے کے باہر گر پڑا۔ پھر مجھے یاد نہیں رہا کہ کب تک میں بے ہوش رہا۔ اِس بے ہوشی کے عالم میں سرکاری بیل گاڑی آئی اور مجھے مُردہ سمجھ کر ڈھونے لگی۔ انھوں نے مجھے مُردہ سمجھ کر بیل گاڑی میں رکھ لیا تھا کہ اتنے میں چودھری خوشی رام کے والد چودھری سیتا رام مرحوم کہیں سے آنکلے۔ انھوں نے میری ہلتی ہوئی ٹانگوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ مجھ میں ابھی جان باقی ہے۔ اُنھوں نے اُسی وقت بیل گاڑی سے مجھے اُتروا لیا۔

خود اپنے کندھے پر اُٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ اور اُن کی دن رات کی خدمت سے اور دوا دارُو سے میں اچھا ہوگیا۔ پھر پلیگ دُور ہوگئی۔ پھر علاقے کے لوگ واپس آگئے۔ پھر میرا گھر بھی بس گیا۔ میری شادی ہوگئی۔ میرے گھر بال بچے ہوئے۔ مجھے عزت اور خوشی۔ مگر سرکار میری جان تو چودھری سیتارام مرحوم کی دی ہوئی تھی۔ وہ جان آج اُس کے خاندان والوں کے کام آگئی۔ اس کی مجھے بڑی خوشی ہے۔

ملک عطا محمد اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اُس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ اُس کی سانس رُک رُک کر چلنے لگی۔ اور پھر بڑی مشکل سے اُس نے آنکھیں کھولیں اور چودھری خوشی رام کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اور اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"چودھری خوشی رام۔ اُس پلیگ کے زمانے سے ایک جان کا قرضہ تمھارے خاندان کا ہمارے خاندان پر چلا آتا ہے۔ آج میں نے وہ قرضہ اُتار دیا۔ بلکہ ایک جان کا اور قرضہ تمھارے اوپر چڑھا دیا۔" ٹھیک ہے"

"چودھری خوشی رام اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔" ٹھیک ہے۔"

دیر تک خاموشی رہی۔ پھر آہستہ سے ملک کا ہاتھ چودھری کے ہاتھ سے جُدا ہوکر اپنے سینے پر چلا گیا۔ اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اور اُس کے رُکتے ہوئے گلے سے اتنا نکلا۔" مجھے بیٹے کی قبر کے ساتھ دفن کرنا۔"

پھر اُس کے نرخرے سے رُک رُک کر اللہ اللہ کی صدا نکلنے لگی۔ پھر وہ صدا بھی معدوم ہوگئی۔ پھر ایک ہچکی آئی اور ڈاکٹر صاحب نے اُس کی نبض

چھوڑکر کہا ۔

"ختم ہوگیا۔

لال خاں مجسٹریٹ نے بیان قلمبند کرتے کرتے اپنا قلم چھوڑ دیا اُس کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ ڈاکٹر صاحب اور تھانے دار دونوں رو رہے تھے چودھری خوشی رام ملک کی لاش سے لپٹا ہوا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

مجسٹریٹ لال خاں نے اپنی کُرسی چھوڑ دی۔ خود اُس نے اپنے ہاتھ سے ملک عطا محمد کی لاش کو سر سے پاؤں تک چادر سے ڈھک دیا۔ اور میرے پتاجی کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے بولے۔

"اس ڈھکی کی پستیوں میں بھی کیسی کیسی بلندیاں ہیں"۔

پھر اُس آپریشن روم میں بہت سے لوگ ایک ساتھ کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھنے لگے۔

۶

ماں جی گُردے کے درد کی مریضہ تھیں۔ سال میں دو تین بار اُنھیں گُردے کے درد کی شکایت پیدا ہوتی تھی کبھی تو یہ درد معمولی نوعیت کا ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی یہ درد ایسی شدّت اختیار کر لیتا کہ ماں جی کے لئے پانچ چھ دن کے لیے بستر سے اُٹھنا محال ہو جاتا۔ اُن کی چیخیں سُن کر میں بھی بلبلا اُٹھتا اور پائنتی سے لگ کر رونے لگتا۔ بارے پتا جی کی دوا دارو سے دو تین دن میں درد کی شدت میں بہت کمی ہو جاتی مگر اس پر بھی وہ تین چار دن اور بستر سے نہ اُٹھ سکتیں۔ اور یہ دن میری بچپن کی آزادی کے بہترین دن ہوتے تھے۔ کہنا تو نہ چاہیئے لیکن حقیقت یہی تھی۔ کہ اُن کے درد میں کمی ہوتے ہی میرے چہرے پر رونق سی آجاتی نہ صرف اِس خیال سے کہ ماں جی اب ٹھیک ہو رہی ہیں بلکہ اس خیال

چمارن ٹھہریں تو دوسروں کو بھنگی ہی بناؤ گی۔

تاراں زور زور سے ہنسنے لگی۔ وہ تو پہلے ہی میرے ہاتھوں کا لمس پہچان گئی تھی مگر مجھے چڑانا جو مقصود تھا اس لیے......

چلو کھیلیں۔

"نہیں"

"کیوں نہیں" میں نے پوچھا۔

"تمھاری ماں ماریں گی"

"نہیں ماریں گی وہ تو بستر پر بیمار پڑی ہیں" ایک لمحے کے لیے تاراں کا چہرہ روشن ہوا تھا پھر بجھ گیا۔ بڑی بیزاری سے بولی

پھر بھی نہیں کھیل سکتی۔

"کیوں نہیں"

ماں کہہ گئی ہیں کہ بشنو براہمن کے گھر گھاس کا ایک گٹھا پہنچانا ہے۔ وہ خود تو دِتّے کے کھیتوں میں کام کرنے گئی ہیں اور مجھے گھاس کاٹنے کے لیے کہہ گئی ہیں۔

"کب تک گھاس کاٹو گی"

"جب تک گٹھا نہ بن جائے"

"گٹھا کب تک بنے گا"

"شام تک"

میں نے غصے سے پیر پٹک دیا تو اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ہم شام تک

کھیلیں گے نہیں اور شام سے پہلے اگر میں گھر نہ پہنچا تو ڈھونڈیا پڑے گی۔
اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ہم آج کھیلیں گے ہی نہیں!

جی ہاں! میرا ایسا ہی خیال ہے۔ تاراں بڑی ادا سے پُتلیاں نچاتے ہوئے بولی۔

میں نے درانتی اُس کے ہاتھ سے چھین کر پرے پھینک دی اور بولا اُٹھو۔ کھیلو!

"نہیں!" وہ بڑی بے لبسی سے بولی" میری ماں ماریں گی!"

عجیب مصیبت ہے۔ میں نے کہا۔ کبھی میری ماں مارتی ہیں کبھی تمھاری ماں مارتی ہیں۔ ان لوگوں کو مارنے کے سوا اور کچھ آتا بھی نہیں ہے۔!

تاراں چُپ رہی اور درانتی اُٹھا کر سر جھکا کر پھر گھاس کاٹنے لگی۔

"ایک ترکیب بتاؤں؟" یکایک میں نے خوش ہو کر کہا۔

"تمھاری سب ترکیبیں پٹائی والی ہوتی ہیں۔ تاراں نے بڑی مایوسی سے کہا" مجھے مت بتاؤ۔

"سنو تو!" میں نے اپنی ترکیب پہ اور بھی خوش ہوتے ہوئے کہا"ہم لوگ ابھی جاتے ہیں اور بشنو براہمن کی گائے کھول کر لے آتے ہیں اور اُسے اِس ڈھلان پر چرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ آخر گائے کو گھاس چاہیئے نا۔ وہ یہاں موجود ہے۔ گھاس کاٹ کر گائے کے پاس لے جانے کی بجائے ہم گائے کھول کر گھاس کے پاس لے آتے ہیں اور بس! اور کیا چاہیئے؟

"ہاں بالکل ٹھیک ہے!" تاراں نے ذرا غور و خوض کرنے کے بعد خوش

ہو کر میرے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں اور میرے ساتھ خوشی سے ناچنے لگی۔
پھر اُس نے درانتی اُٹھا کر اپنے گھر کے پچھواڑے کی باڑ میں کدو کی بیلوں میں
چھپا دی اور میرے ساتھ بشنو براہمن کی باڑی کی طرف دوڑنے لگی جہاں
گائے بندھی تھی۔

مگر باڑی کے اندر جا کر ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ گائے
وہاں تھان پر نہ تھی۔ ہم نے اُسے باہر ڈھونڈا۔ وہ کہیں نہ ملی۔ اُسے تلاش
کرتے ہوئے ہم لوگ نیچے پھول والے چشمے پر پہنچ گئے۔ یہ اس لیے پھول ڈالا
چشمہ کہلاتا تھا کہ یہاں اس چشمے کے کنارے اور اُوپر ٹیلے پر سردی کے سوا
ہر موسم میں پھول ہوتے تھے۔ اور جس ٹیلے کے نیچے سے یہ چشمہ نکلتا تھا اُس
پر اُودے انگور کی بیلوں کے جھاڑ تھے جو کاؤ کے ایک جھنڈ پر چڑھے ہوئے
تھے۔ کاؤ کے جھنڈ کے درمیان شہد کی مکھیوں کا ایک چھتہ تھا اور انگور کی بیلوں
کے بڑے بڑے سبز پتوں کے جھومروں کے اندر سے شہد کی مکھیوں کے بھنبھناتے
کی گونج ایسے سنائی دیتی تھی جیسے اُن بیلوں کے اندر بھی کوئی دوسرا پھول والا
چشمہ گنگنا رہا ہو۔ یہاں عجیب سناٹا اور خاموشی تھی۔ چھوٹے چھوٹے نیلے پتھروں
کے اردگرد بھورے پروں والی آبی تتلیاں سطح آب پر تیرتی پھرتی ہیں کئی
مینڈک کنارے پر دھوپ سینک رہے تھے اور ہمیں دیکھتے ہی پھدک پھدک
کر پانی میں چلے گئے۔ چشمہ میں انگور کے کئی سبز پتے تیر رہے تھے اور اُن پر
پانی کے قطرے یوں چمک رہے تھے جیسے کسی کی کھلی ہتھیلی پر جواہرات
چمک رہے ہوں۔

تاراں نے چشمے کے کنارے پھولوں میں سے چند پھول انتخاب کر لیے اور انھیں توڑ کر اُن کا گچھا بنا کر اپنے بالوں میں اُڑس لیا۔

پھر تاراں نے مجھے بتایا۔

یہ تتلی تارہ پھول ہیں۔

نہیں یہ بنیری ہیں۔ میرے پتا جی نے مجھے بتایا تھا۔

نہیں یہ تتلی تارہ ہیں۔

گہرے اودے رنگ کے مخملیں پتیوں والے پھول تھے۔ جن کے مرکز میں ایک پیلا دھبہ تھا اور دُور سے دیکھنے سے واقعی یہ معلوم ہوتا تھا گویا ہرے پتوں پر اُودی اُودی خوش رنگ تتلیاں بیٹھی ہیں۔

میں نے کہا ـــــــ "ان پھولوں کی ایک کہانی ہے۔"

"کیا کہانی ہے؟"

"نہیں سُناتے۔" میں نے اِٹھلا کر کہا۔

"نہیں سُناؤ گے!" تاراں نے میری پیٹھ پر ایک مُکا مار کر کہا۔

"نہیں۔"

"اب بھی نہیں؟" تاراں نے میری پیٹھ پر دوسرا مُکا جڑ دیا اپنے جسم کی پُوری طاقت سے۔

"ہرگز نہیں!" میں نے مُکے کھاتے ہوئے بھی ہنس کر کہا۔

تاراں روہانسی ہو کر بولی۔ "پھر کیسے سُناؤ گے؟"

"ہماری ایک شرط ہے۔

"کیا؟"

"تم بنفشے کے پھولوں کا ایک ہار بنا کر ہمارے گلے میں ڈال دو۔ ہم تمھیں پنیری کے پھولوں کی کہانی سنائیں گے۔"

اچھا۔ کہہ کر تاراں بڑی بے دلی سے اٹھی کیونکہ بنفشے کے چھوٹے چھوٹے پھولوں کا ہار بناتے ہیں بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اور بڑا وقت صرف ہوتا ہے۔

تاراں نے ٹیلے پر اُگی ہوئی گھاس کے خاکستری تیلیوں والے اونچے اونچے خوشے توڑ لیے۔ باریک سیدھے لانبے تاگے کی طرح صاف ستھرے خوشے اور پھر بنفشے کے پھول توڑ کر انھیں ان خوشوں میں پرونے لگی جب دونوں خوشے پرو دیئے جائیں گے تو تاراں انھیں ڈنٹھل پر گانٹھ لگا کر جوڑ دے گی۔ بس ہار تیار ہو جائے گا۔

اچھا اب کہانی سناؤ؟ تاراں بنفشے کے پھول پروتے پروتے بولی۔

میں نے کہا ——— "ایک لڑکا تھا۔"

تاراں بولی ——— "تیرے جیسا!"

"ہاں میرے ایسا۔"

"پھر!"

"اور ایک لڑکی تھی۔"

"میری ایسی!"

"نہیں تجھ سے اچھی!" میں نے جواب دیا۔

"ہشت!" تاراں نے غصّے سے پھول پھینک دیئے۔

"اچھا! اچھا! بالکل تیری ایسی لڑکی تھی وہ مگر وہ دونوں بھائی بہن تھے اور اُنھیں تتلیاں پکڑنے کا بہت شوق تھا۔ وہ پھولوں پر اُڑنے والی چوڑے چوڑے پروں والی تتلیاں پکڑتے اور پانی پر تیرنے والی چھوٹے چھوٹے شفاف پروں والی تتلیاں پکڑتے اور اُنھیں پکڑ کر اُن کے نازک جسم میں ایک تیز پن چبھو کر اُسے مار دیتے اور اُسے بلاٹنگ پیپر پر خشک کرکے اپنی البم میں سجا دیتے۔

"بلاٹنگ پیپر کیا ہوتا ہے؟" تاراں نے پوچھا۔

"ایک طرح کا کاغذ ہوتا ہے موٹا اور کھُردرا۔ وہ سیاہی کو چُوس لیتا ہے اور پانی کو جذب کر لیتا ہے۔ میرے گھر میں بہت سے بلاٹنگ پیپر ہیں تمھیں دکھاؤں گا۔"

"ایک مجھے دینا۔"

"اچھا دے دوں گا۔"

"اچھا تو آگے چلو۔ پھر کیا ہُوا!"

"پھر یہ ہُوا کہ اُن دونوں بھائی بہنوں کے ماں باپ اُنھیں تتلیاں مارنے سے بہت منع کرتے تھے مگر وہ دونوں ہماری طرح شیطان بچّے تھے باز نہیں آتے تھے۔"

"میں تو شیطان نہیں ہوں۔ تُو ہوگا!"

"تُو ہوگی۔"

"ہاتھ توڑ ڈالوں گی اگر تو نے مجھے پھر شیطان کہا" تاراں نے دھمکی دی اور میں ڈر گیا۔ جلدی جلدی سے آگے کہانی سنانے لگا۔

ایک دن کیا ہوا کہ اُن بچوں کے باغ میں دو خوب صورت تتلیاں آئیں ایک کا رنگ بسنتی لال اور اُودا تھا۔ دوسری نیلی سبز اور گلابی پروں والی تھی ایسی خوب صورت تتلیاں اُن کے باغ میں اِس سے پہلے کبھی نہ آئیں تھیں۔ دونوں بھائی بہن انھیں پکڑنے کے لیے دوڑے۔ تتلیاں پھولوں سے اُڑتی اُڑتی باغ سے باہر نکل گئیں۔ دونوں بھائی بہنوں نے اُن کا پیچھا کیا۔ باغ سے ڈھلان، ڈھلان سے ندی، ندی پار کر کے ایک پہاڑ آتا تھا۔ دونوں بھائی بہن تتلیوں کا تعاقب کرتے ہوئے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ پہاڑ پر ایک جنگل تھا۔

بہت گھنا۔؟

بے حد گھنا۔!

اور ڈراؤنا۔

اور ڈراؤنا۔

اور وہاں ایک شیر رہتا تھا؟ تاراں نے پوچھا۔

کہانی تو سناتی ہے یا میں؟

اچھا اچھا آگے سناؤ۔

اُس جنگل میں جا کر ایک تتلی ایک طرف کو بھاگی اور دوسری تتلی دوسری طرف دونوں بھائی بہن جُدا ہو گئے۔ بھائی نے بسنتی لال اُودی تتلی کا پیچھا کیا۔ بہن

نیلی سبز اور گلابی تتلی کے پیچھے بھاگی۔ جنگل گھنا ہوتا گیا۔ گہرا ہوتا گیا۔ کالا ہوتا گیا۔ دن میں رات سی نظر آنے لگی۔ آخر بھائی نے خوشی کی ایک چیخ مار کر بسنتی لال اور ہری تتلی کو پکڑ لیا۔ اور چلّا کر کہا ـــــ میں نے پکڑ لی۔ بہن میں نے تتلی پکڑ لی۔ مگر مُڑ کر جو دیکھا تو بہن غائب ہے!

پھر کیا ہُوا؟ تاراں کا سانس رُکنے سا لگا۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے کُھلتی چلی گئیں۔

پھر ننّھا بھائی ننّھی بہن کو جنگل میں ڈھونڈنے کے لیے نکلا۔ پیڑوں سے ٹکراتا شاخوں سے اُلجھتا، کانٹے دار جھاڑیوں سے گزرتا اُس پھڑپھڑاتی ہوئی تتلی کو ہاتھ میں لیے اپنی بہن کو آواز دیتا ہُوا اُسے ڈھونڈنے لگا۔ اسی طرح کئی گھنٹے گزر گئے مگر اُس کی بہن اُسے نہ ملی۔

پھر بہن کہاں گئی؟

بہن دوسری تتلی کے پیچھے گئی تھی تا وہ نیلی سبز اور گلابی رنگ والی تتلی کے پیچھے پیچھے بھاگتی جا رہی تھی۔ تتلی آگے آگے اُڑتی جا رہی تھی جنگل گھنا ہوتا گیا۔ تتلی اندر ہی اندر جنگل کے اندر اُڑتی گئی۔ بہن پیچھے بھاگتی گئی۔ تتلی کو دیکھتے دیکھتے اُسے یہ خیال ہی نہ رہا کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ آگے ایک چھوٹی سی ڈھلوان تھی۔ تتلی اُس پر سے اُڑ گئی۔ بہن نے بھی چھلانگ لگائی نیچے جنگل میں گہرے پانی کا ایک چشمہ تھا۔ بہن اُس میں ڈوب گئی۔

ہائے! تاراں کے مُنہ سے بے اختیار نکلا اور اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

" پھر کیا ہُوا؟" اُس نے اپنے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

جب دوپہر ڈھل گئی اور شام ہونے کو آئی اور بھائی کو اُس کی بہن نہ ملی۔ تو وہ تھک کر ایک گِرے ہوئے چیل کے پیڑ کے تنے پر بیٹھ گیا۔ اور رونے لگا اتنے میں اُس کے کانوں میں آواز آئی۔

اگر میں تجھے تیری بہن ڈھونڈ دوں تو مجھے کیا دے گا۔

بچّے نے چاروں طرف حیرت سے دیکھا مگر اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آواز کدھر سے آئی تھی۔ اتنے میں اُس کے کانوں میں پھر وہی آواز آئی۔

" بھیّا کو بہن سے ملا دوں تو مجھے کیا دے گا؟"

یہ اُس کے ہاتھوں میں پھڑ پھڑانے والی تتلی بول رہی تھی، لال بسنتی اور ہری تتلی جو دراصل ایک پری تھی۔

ہاں جبھی وہ بولتی تھی! تاراں کے چہرے پر اُمید اور خوشی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑنے لگی۔

بھائی بولا۔ اگر تو میری بہن مجھ سے ملا دے تو مَیں تجھے آزاد کر دوں گا۔

پہلے مجھے آزاد کر!

لے! بھائی نے تتلی ہوا میں چھوڑ دی۔ تتلی نے اپنے رنگین پر پھڑ پھڑائے اور پھر ہوا میں اُڑتے اُڑتے بولی۔

اب میرے پیچھے پیچھے آجا!

تتلی اُسے چٹانوں، جھاڑیوں، ٹیلوں، تنگ اور کٹھن راستوں سے لیجاتی ہوئی اُس گھاٹی پر لے گئی جس کے نیچے وہی گہرا چشمہ بہہ رہا تھا۔ جہاں اُس کی

بہن ڈوبی تھی اور جس کنارے پر وہ ڈوبی تھی اُس کے قریب کی گھاس پر گہرے اُودے مخملیں پتیوں والا تتلی نما ایک پھول کھلا ہُوا تھا جس کا ایک گچھا اِس وقت تمھارے بالوں میں ہے۔

"یہاں ہے تمھاری بہن! تتلی نے کہا۔

کہاں۔

وہ اِس چشمے میں ڈوب کر مرگئی ہے۔ تتلی نے افسوسناک لہجے میں کہا۔

بھائی اپنی بہن کے لئے رونے لگا اور بسنتی لال ہری تتلی کو جھوٹا اور دھوکے باز کہنے لگا۔ تو تتلی نے مسکرا کر کہا ـــــ میں تیری بہن کو پھر سے زندہ کر سکتی ہوں اگر تو ایک وعدہ کرے۔

میں وعدہ کرتا ہوں!

وعدہ کر کہ آئندہ کبھی معصوم تتلیوں کو مارا نہیں کرے گا!

میں وعدہ کرتا ہوں! بھائی نے صدق دل سے کہا۔

تب تتلی اُس سے بولی "! اچھا اب ایسا کر۔ اس ڈھلوان سے نیچے چشمہ کے کنارے چلا جا اور جہاں اُودے رنگ کا پھول کھلا ہے۔ اُس پھول کو توڑ دے۔

پھول کو توڑنے سے کیا ہو گا۔

جیسا میں کہتی ہو ویسا کر!

تب بھائی اُس کٹھن ڈھلوان سے پھسلتا پھسلتا بڑی مشکل سے اُس چشمے کے کنارے پہنچا جہاں وہ اودے رنگ کا پھول کھلا ہُوا تھا۔ جونہی اُس نے

ہاتھ بڑھا کر اُس پھُول کو توڑا پھُول اُس کے ہاتھ سے غائب ہو گیا اور جہاں سے اُس نے پھُول توڑا تھا وہاں پر اُس کی بہن پانی میں کھیلتی ہوئی کھڑی تھی

ارے! تاراں خوشی سے چلاّئی۔

تب بھائی بہن دونوں ایک دوسرے کے گلے ملے اور خوشی سے رونے لگے!

اُس وقت گہری شام ہو چکی تھی اور جنگل سے واپس جانے کا راستہ نہ ملتا تھا مگر اُن دونوں تتلیوں نے پھر اُن بچوں پر مہربانی کی اُنھوں نے اُن دونوں بچوں کو اپنے پروں پر بٹھا لیا۔ کیونکہ وہ پریاں تھیں اور اب اُن کے پَر بہت بڑے بڑے اور روشن ہو گئے تھے اور رات کے اندھیرے میں ایسے چمکتے تھے جیسے جگنو چمکتے ہیں۔ وہ دونوں پریاں اُن دونوں بچوں کو اپنے پروں پر بٹھا کر اُنھیں جنگل کے اُوپر اُڑا لے گئیں اور آنکھ جھپکتے ہی اُنھیں اُن کے ماں باپ کے باغ میں پہنچا دیا۔

بہت اچھی کہانی ہے ـــــ! تاراں نے خوش ہو کر بنفشے کے پھولوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔

میں نے کہا۔ تب سے باغوں میں اور چشموں کے کنارے یہ پنیری کے پھُول کھلتے ہیں۔ تاکہ بچے اُن سے اپنا دل بہلائیں اور معصوم تتلیوں کی جان نہ لیں۔

مگر تاراں کا جی اب کہانی میں نہ تھا۔ جس وقت سے اُس نے یہ سُن لیا تھا۔ کہ بھائی کو بہن مل گئی تو اُس وقت سے اُس کے لیے کہانی ختم ہو چکی تھی اور وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی یکایک اُس کی نظر چشمے سے دُور

مغرب کی طرف انجیر کے پیڑ پر پڑی جس پر انگور کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔
اور وہ چلا کر مجھ سے کہنے لگی آؤ وہاں تک دوڑ لگائیں اور جو جیت جائے
وہ دوسرے کو پانچ ناشپاتیاں دے۔

واہ! میں نے کہا۔ تم کہاں سے ناشپاتی لاؤ گی۔ ناشپاتیاں تو میرے
باغ میں ہیں۔

اگر میں ہار گئی تو میں تم سے لے کر تم کو دے دوں گی۔ تاراں نے بڑی
سادگی سے کہا۔

مجھے اُس کی شرط تو پسند نہ آئی۔ مگر تاراں سے کھیلتے میں اُس کی بہت
سی شرطیں اچھی یا بُری دونوں قسم کی ماننا پڑتی تھیں۔ اِس لیے میں نے دوڑ لگا دی۔
تاراں بھی بہت تیز دوڑتی تھی اور کئی بار جیت بھی جاتی تھی۔ مگر آج میں جیت
گیا اور اُس سے ناشپاتی طلب کرنے لگا۔ معاملے کو پلٹانے کے لیے تاراں نے
انگوروں کی ایک اونچی بیل کی جانب اشارہ کیا جو انجیر کے ایک بڑے ڈال
پر پینگ کی صورت میں لٹکی ہوئی تھی۔

تاراں بولی ——— آؤ اُس پر جھولا جھولیں۔

"اور اگر بیل بیچ میں ہی سے ٹوٹ گئی؟" میں نے پوچھا۔

نہیں ٹوٹے گی۔ انگور کی بیل بڑی پکّی ہوتی ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کیسے
اس درخت کو چاروں طرف سے جکڑ رکھا ہے۔

یہ واقعی سچ تھا۔ انگور کی بیل نے واقعی درخت کو جکڑ رکھا تھا۔ بیل زمین
سے شروع ہوتی تھی جہاں سے درخت کا تنا شروع ہوتا تھا اور تنے سے لپٹی

ہوئی اوپر تک چلی گئی تھی ۔ درخت کو ایسے میں کیا محسوس ہوگا یہ تو میں معلوم نہ کر سکا۔ ہاں اتنا جانتا ہوں ۔کہ ہم بچّوں کو ایک پیڑ سے گرمیوں میں انگور اور انجیر کھانے کو ملتے تھے ۔

"پہلے میں پینگ لوں گا۔" میں نے کہا ۔

"نہیں پہلے میں!" تاراں چلائی ۔

"نہیں شرط میں جیتا ہوں اس لیے پہلے میں پینگ لوں گا۔"

اگر تم پہلے پینگ لو گے تو میں وہ پانچ ناشپاتیاں نہیں دوں گی ۔ تاراں نے کہا ۔

"مجھے منظور ہے!" میں نے کہا ۔

میں درخت کے تنے پر چڑھ کر اُس ڈال پر پہنچ گیا جہاں سے انگور کی بیل پینگ کی رسّی کی صورت میں لٹک رہی تھی ۔ میں نے دونوں طرف سے اُس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بیچ میں کھڑا ہو کر پینگ لینے لگا ۔ دو ایک مرتبہ چر رچر رکی آواز پیدا ہوئی ۔ چند چھوٹی چھوٹی شاخیں اور بیل کے پتّے ٹوٹ گئے ۔ مگر بیل مضبوط تھی ۔ میں مزے سے ہی پینگ بڑھاتا رہا ۔

نیچے اُترو ۔ نیچے اُترو ۔ اب میری باری ہے ۔ تاراں مجھے نیچے زمین سے دیکھ کر چلائی ۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نیچے اُتر آیا اور تاراں جھُولا جھولنے لگی ۔ پہلے تو بیل کی پینگ میں مزے سے بیٹھی ہوئے ہوئے جھُولتی رہی ۔ پھر کھڑی ہو کے اُس نے جو زور زور سے پینگ کے جھونٹے لیے تو بیل جگہ جگہ سے کرڑ کرڑ کی آواز

پیدا کرنے لگی - میں نے گھبرا کر نیچے سے چلا کر کہا - آہستہ سے تاراں آہستہ سے - بیل ٹوٹ جائے گی !

تاراں لاپروائی سے بولی "نہیں ٹوٹے گی ، دیکھ لو - میں تم سے پینگ اُونچی بڑھا سکتی ہوں اگر کہو تو اُس اُوپر کی ٹہنی کو پینگ بڑھاتے بڑھاتے چھو لوں ؟ انجیر کی وہ شاخ کافی اونچی تھی اور جیب میں پینگ بڑھا رہا تھا - اُس وقت کوشش کے باوجود وہ شاخ مجھ سے نہ چھوئی گئی تھی - اس لیے میں نے بھی دانت پیس کر کہہ دیا ــــــ چھو لو تو دونّی دوں گا -

تاراں زور زور سے پینگ بڑھانے لگی پہلے ہلّے میں دوسرے ہلّے میں اور تیسرے ہلّے میں وہ ناکام رہی - مگر چوتھے ہلّے میں اُس نے اِس زور کا جھونٹا لیا کہ شاخ اُس کے ہاتھوں میں آگئی - شاخ کو توڑ کر وہ زور سے خوشی سے چیخی کہ عین اُسی وقت انگور کی بیل کی پینگ نے ایک طرف سے انجیر کی ڈال کو چھوڑ دیا اور ہوا میں اُونچی اُڑتی ہوئی تاراں بڑی تیزی سے زمین کی طرف گرنے لگی - میں نے گھبرا کر دونوں ہاتھ اُسے بچانے کے لیے پھیلا دیئے اور اُسے بچانے کے لیے دوڑا - وہ سیدھی اُوپر سے نیچے میرے بازوؤں میں گری اور مجھے بھی اپنے ساتھ گراتے ہوئے زمین پر لوٹتی گئی - چند فٹ تک ہم دونوں اُس کے گرنے کے دھکے سے ڈھلوان پر لڑھکتے گئے - ڈھلوان کا ایک پتھر میرے سر سے لگا اور اُس سے خون جاری ہو گیا - تھوڑی دیر کے بعد جب ہم دونوں اُٹھے تو دونوں لہولہان تھے اور دونوں رو رہے تھے -

"تم مجھے یہاں لے کے آئے تھے" - تاراں روتے روتے مجھے طعنہ دیتے

ہوئے بولی - ورنہ میں تو لشنو کی گائے کے لیے گھاس کاٹ رہی تھی۔

"اور انگور کی بیل پر پتنگ لینے کے لیے کس نے کہا تھا؟" میں نے سسکتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

مگر شکر ہے کہ ہم دونوں زندہ تھے۔ اگر وہ میرے بازوؤں میں نہ گرتی اور زمین پر گرتی تو شاید مر جاتی اس کے بعد اگر میں اُس کے ساتھ ہی نہ لڑھک جاتا تو شاید مجھے بھی اُس کے وزن کے دھکے سے سخت چوٹ لگتی سر میں تو چوٹ اب بھی خاصی تھی اور لہو بھی بہہ رہا تھا۔ مگر ہم دونوں زندہ تھے۔ روتے روتے ہم دونوں واپس گھر پہنچے تو پہلے پٹائی اور بعد میں مرہم پٹی کے بعد معلوم ہوا کہ میرے سر کی ہڈی بس ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی ہے لیکن تاراں کی ایک بانہہ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ میرا زخم تو پندرہ بیس روز میں بھر گیا۔ لیکن تاراں ڈیڑھ دو ماہ تک اپنی بانہہ کو لکڑی کی کھپچیوں میں بندھوائے پھرتی رہی۔

اور اب ؟

اب دل کے بہت سے زخم مندمل ہو کر بے نشان ہو چکے ہیں۔ لیکن سر پر اُس زخم کا نشان باقی ہے۔ اب وہاں پر ایک کالا سا مَتا بن گیا ہے۔ کبھی کبھی بے خبری میں جب اِس مَتے پر ہاتھ لگ جاتا ہے تو ذہن سے حال کے تمام بہیوے غائب ہو جاتے ہیں۔ ذہن میں ایک پتنگ سی جھولنے لگتی ہے اور انگور کی بیل کے ہالے میں ایک شوخ و شنگ لڑکی ہوا میں اُڑتی ہوئی نظر آتی ہے!

گھر میں ایک عجیب سی حالت تھی - ادھر میں اپنے ماں باپ کا چھوٹا سا اکلوتا لڑکا سر کی چوٹ سے پٹی باندھے بستر پر پڑا تھا ادھر میری ماں جی گردے کے درد کی تکلیف سے اپنے بستر پر کراہ رہی تھیں ماں جی کے گردے کا درد جو اس سے پہلے پانچ چھ روز میں میرے پتاجی کی دوا سے کم ہو جاتا تھا - اور کم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتا تھا اب کسی طرح دُور نہ ہوتا تھا - بلکہ ایک روز تو درد اس شدت سے بڑھا کہ ماں جی اُس درد کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئیں -

ان دنوں سے زیادہ میں نے اپنے پتاجی کو پریشان نہ دیکھا ہو گا - حالانکہ وہ ڈاکٹر تھے اور علاقے میں اُن کے علاج اور ہاتھوں کی شفا کی دھوم تھی - مگر میری ماں جی کی حالت دیکھ کر وہ بھی ایک دفعہ چکرا گئے - مجھے یاد ہے وہ اُس روز دن بھر ماں جی کے پلنگ کی پائنتی سے لگے اُن کی دیکھ بھال کرتے رہے اور جب وہ ہوش میں آئیں اور پھر شدید درد سے چیخنے لگیں تو پتاجی نے اُنھیں ایک نیند آور انجکشن دے دیا جو مرض کا علاج تو نہ تھا لیکن وقتی طور پر ماں جی کو آرام تو مل گیا تھا اور وہ شام کے چھ سات بجے تک سوتی رہیں اور جب ہوش میں آئیں اُس وقت پتاجی نے اُنھیں ایک اور دوا پلائی جس سے ماں جی کے گردے کا درد دُور تو نہیں ہُوا لیکن بہت کم ہو گیا - مجھے یاد ہے دن میں پتاجی مختلف کتابوں کو اُلٹتے پلٹتے رہے تھے اور غالباً اسی دوا کو ڈھونڈتے رہے تھے - انھوں نے کئی کتابوں سے مشورہ کرنے کے بعد اس دوا کا نسخہ لکھا تھا اور اپنے ہات سے اُسے ڈسپنسری میں جا کر بنایا تھا -

رات کے وقت جب پتا جی بستر پر لیٹنے لگے تو ماں جی نے اپنے پلنگ سے سسکتے ہوئے میرے بارے میں پوچھا!

کاکا کیسا ہے؟

میرے لیے تیسرا پلنگ اس کمرے میں بچھا دیا گیا تھا۔ میں اپنے بستر میں دبکا ہُوا اپنی پرانی عادت کے مطابق اپنے ماں باپ کی باتیں سُن رہا تھا۔

ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے والد نے تھکی ہوئی غمزدہ آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر ماں جی بولیں۔

یہ جنم جلی تاراں اِس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بچہ ہے۔ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔

لیکن یہ جنم جلی تاراں تو میرے بچے کی جان لے گی۔ وہ تو بھگوان نرنکار پر مشتور میرے بچے کا رکھا ہے۔ اُس نے بچا لیا۔ ورنہ تم ہی بتاؤ مرنے میں کیا کسر تھی۔ میں تو کہتی ہوں تم۔ اسے بڑے شہر لے جا کر بورڈنگ میں ڈال دو۔

کہنے کو تم ہمیشہ کہتی ہو۔ لیکن بھجواتے ہوئے عین وقت پر مُکر جاتی ہو۔

کیا کروں۔ اکیلا بچہ ہے۔ ماں کا دل ہے نہیں مانتا۔ تمھیں کیا معلوم۔ تم نے کسی کو نو مہینے کوکھ میں رکھا ہوتا تو تمھیں معلوم ہوتا۔

"مجھے تو تمھاری فکر ہے اب تو" میرے پتا نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ میرے خیال میں تو تمھارے گُردے میں پتھری ہے۔

"یہ تو تم تین سال سے کہہ رہے ہو"

"مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے"

یقین ہو گیا ہے تو جلدی سے آپریشن کر ڈالو ۔ قسمت میں ہو گا تو بچ جاؤں گی ورنہ اس درد سے تو چھٹکارا پا ؤں گی ۔ اب یہ درد مجھ سے سہا نہیں جاتا۔

"آپریشن کیسے کر دوں ۔ میرا دل کانپتا ہے"۔ پتا جی بولے ۔

کیوں تم نے گردے کے کئی آپریشن کئے ہیں۔ ابھی پچھلے سال موضع باغ کا نمبردار پیندا خاں گردے کا آپریشن کرانے آیا تھا اور تم سے ٹھیک ہو کر چلا گیا۔ یاد ہے ؟

یاد ہے ـــــ مگر وہ بھی یاد ہے جب گُزراہ کے پنڈت طوطی رام کی بیوی لکشمی کا آپریشن کیا تھا ۔ وہ بھی تو گردے ہی کا اپریشن تھا۔ اُس کی ارتھی اس ہسپتال سے اُٹھی تھی ۔

وہ تو اُس کی آئی تھی ۔ آگئی ۔ اگر میری آئی ہوگی تو آجائے گی ۔ اچھا ہو گا ۔ میں تمھارے جیتے جی اپنے پران تیاگ دوں گی ۔ اس سے زیادہ اِستری کو اور کیا چاہیئے !

تم مرنے کی باتیں کرتی ہو ۔ میں تمھیں لاہور بھیجنے کی سوچ رہا ہوں ۔

لاہور ؟ ماں جی حیرت سے بولیں ۔

ہاں لاہور ! وہاں میرے اُستاد کرنل بھاٹیہ رہتے ہیں ۔ وہ گردے کا آپریشن اِس صفائی سے کرتے ہیں جس طرح میں اپنا شیو کرتا ہوں۔ اگر وہ تمھارا آپریشن کریں تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔

مگر لاہور ہم کیسے جا سکتے ہیں ؟ ماں جی نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ تین دن تو گھوڑوں کا سفر ہے ۔ پھر ایک روز لاری کا سفر ہے ۔ پھر ایک رات ریل گاڑی

کا سفر ہے اور پھر پیسہ؟

ہاں پیسے ہی کی تو بات ہے؟ میرے پتا جی نے فکر مند ہو کر کہا۔ آنے جانے، ہسپتال میں رہنے اور آپریشن کے خرچ وغیرہ میں دو ہزار سے کم کیا صرف ہوگا۔

مگر دو ہزار کہاں سے لائیں گے؟ ماں جی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ یہاں جو ہر ماہ تم لاتے ہو وہ ہر ماہ ختم ہو جاتا ہے اور اوپر کی آمدنی کی تم نے قسم کھا رکھی ہے۔

وہ تو ٹھیک ہے ـــــ پتا جی نے بات کو پلٹتے ہوئے کہا۔ لیکن اگر تم اپنا زیور دے دو . . . . . .

اپنا زیور دے دوں؟ ماں جی اِس حیرت سے بولیں جیسے کسی نے اچانک اُن کے گلے پر چھری رکھدی ہو اور اُن کا گلا رُندھ گیا ہو۔ اپنی جان بچانے کے لیے وہ زیور دے دوں جو میں نے اپنے کاکے کی بہو کے لیے رکھا ہُوا ہے؟ تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں تو جب اپنے کاکے کا بیاہ کروں گی وہ پالن ہار پر میسر اُس کی بڑی عمر کرے۔ وہ جب جوان ہو گا اور میں اُس کے لیے اپنے ہاتھوں سے اُس کی بہو کی ڈولی لاؤں گی تو اپنا سارا زیور اپنی بہو کے گلے میں پہنا دونگی۔

ماں جی دیر تک چُپ رہیں۔ کمرے کی مدھم مدھم روشنی میں اُن کی آنکھیں غیر معمولی طور سے چمک رہی تھیں۔ وہ کسی خوش آئیند تصور میں مسحور آنکھیں جیسے اُن کا بیٹا جوان ہو گیا ہو، جیسے وہ گھوڑے پر چڑھا برات کے آگے آگے چل رہا ہو۔ جیسے شہنائی بج رہی ہے، جیسے ڈولی گھر پر آگئی ہے۔ جیسے ماں جی بہو کا گھونگھٹ اُتار کر اُس کا چاند سا مکھڑا دیکھ رہی ہیں۔ ایک ماں موت کے

کنارے دردگرد سے بے تاب ہو کر بھی کیسے کیسے خواب دیکھتی ہے
مگر کچھ اپنے لیے نہیں۔ کبھی اپنے شوہر کے لیے کبھی اپنے بچے کے لیے مگر کچھ
اپنے لیے نہیں۔ یہ حقیقت میں اُس نیم اندھیرے میں کسی غیر معمولی جذبے سے
چمکتی ہوئی آنکھوں سے جانتا ہوں۔

سو گئے؟ میری ماں جی میرے پتاجی کو دیر سے خاموش دیکھ کر بولیں۔

جواب میں پتا جی کچھ نہیں بولے۔ ہولے ہولے گنگنانے لگے۔

"چھٹی جب کان اس بن میں"

پھر وہ سٹرا گیت۔ ماں جی تنگ کر بولیں۔ رات کا وقت ہے۔ بھگوان
کو یاد کرو۔ کوئی ایشور کا بھجن گاؤ۔

مگر پتاجی ہولے ہولے وہی گنگناتے رہے۔

"چھٹی جب کان اس بن میں"

اور میں اِسی گیت کی لوری سنتے سنتے سو گیا۔

ماں جی کو بستر پر پڑے بیس روز گزر چکے تھے۔ درد کبھی کم ہو جاتا تھا کبھی
بڑھ جاتا تھا مگر کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا۔ ماں جی بے حد نحیف ہو گئیں تھیں اور
پتاجی کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ سارے گھر میں
ایک ہولناک اُداسی کی فضا بڑھتی جا رہی تھی۔ ماں جی جتنا اپنے آپریشن پر
اصرار کرتیں پتاجی اتنی ہی سختی سے اُسے ٹالتے جا رہے تھے۔ حالانکہ انھیں
معلوم تھا اُس کا نتیجہ خطرناک ہوگا مگر وہ ٹالے جا رہے تھے۔ اُن کے چہرے

بُشرے سے اندازہ ہوتا تھا جیسے اُن کے دل کے اندر ایک شدید جنگ جاری ہے اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ کیا کریں؟

ایک رات جب اُن کے خیال کے مطابق میں سو گیا تھا اور گھر کے دوسرے افراد بھی نیند میں بے خبر تھے وہ آہستہ سے اپنے بستر سے اُٹھے۔ دیوار سے ٹنگے ہوئے کوٹ کی جیب ٹٹول کر اُنھوں نے کوئی چیز نکالی اور اُسے ماں جی کے سرہانے جا کر اُنھیں دیتے ہوئے بولے۔

"اسے رکھ لو۔"

"کیا ہے؟"

"دو ہزار روپے کی تھیلی!"

ماں جی ایک دم بستر سے اُٹھ بیٹھیں۔ لیمپ کی روشنی تیز کر کے اُنھوں نے مٹیلے نیلے رنگ کی دھاری دار تھیلی کے اندر جھانک کر دیکھا۔ اُس میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں۔ اُنھیں کامل احتیاط سے گنا۔ پورے دو ہزار روپے تھے۔

"کہاں سے لائے؟"

پتا جی چُپ رہے۔

میں پوچھتی ہوں کہاں سے لائے۔ ماں جی نے اصرار کیا۔

"رشوت لی ہے!" پتا جی سہم کر بولے۔

ماں جی سناٹے میں آ گئیں۔ نوٹ اُن کے کمزور ہاتھوں میں کانپنے لگے۔

پتا جی اب ہولے ہولے کہنے لگے۔ وہ موضع پوکھر کے راجپوتوں میں لڑائی

ہوگئی ۔ دو سگے بھائیوں میں لڑائی ہوگئی تھی۔ ایک کھیت پر۔ ٹھاکر چین سنگھ اور ٹھاکر نین سنگھ دونوں بڑے جوان اور تگڑے راجپوت ہیں اور بے حد امیر ہیں۔ روپے کی اُن کو پروا نہیں اور دیکھا جائے تو زمین کی بھی اُن کو پروا نہیں کیونکہ دونوں بھائیوں کے پاس راجہ صاحب کی عطا کی ہوئی جاگیریں ہیں۔ مگر یہ کھیت کا جھگڑا آن کا سوال بن گیا تھا۔ دونوں چھویاں لے کر مقابلے پر آ گئے۔ دونوں بھائی زخمی ہو کر کل سے میرے ہسپتال میں پڑے ہیں۔

ہاں تم نے کل بتایا تھا۔

مگر ٹھاکر چین سنگھ کو جو چوٹیں لگیں ہیں وہ شدید نوعیت کی ہیں اور نین سنگھ کو جو ضربیں لگی ہیں وہ خفیف نوعیت کی ہیں۔ اگر صلح صفائی نہ ہو اور مقدمہ چلے تو چین سنگھ کو تین سال کی سزا تو ضرور ہو گی۔ اس لیے نین سنگھ چاہتا ہے کہ میں اپنی ڈاکٹری رپورٹ میں اُس کی ضربِ خفیف کو ضربِ شدید بنا دوں تاکہ چین سنگھ کو تین سال کی سزا ہو سکے۔ اُدھر چین سنگھ یہ چاہتا ہے کہ اُس کی ضربوں کو ضرب شدید ہی لکھا جائے تاکہ نین سنگھ کو تین سال کی سزا ہو سکے۔ دونوں کل سے مجھے رشوت دے رہے تھے۔ چین سنگھ کی ضربیں تو خیر شدید نوعیت کی ہیں اس لیے وہ پانسو روپے پر آ کے رُک گیا۔ لیکن نین سنگھ آج دو ہزار روپے تک بڑھ گیا۔ اِس لیے میں نے اُس سے روپے لے لیے۔

ماں نے گھبرا کر کہا ——— "یہ دو ہزار روپے لے کر اب تم جھوٹی رپورٹ لکھو گے ؟"

ہاں - پتا جی بولے لیکن میں نہ وہ لکھوں گا جو نین سنگھ چاہتا ہے نہ وہ جو چین سنگھ چاہتا ہے -

" پھر کیا لکھو گے ؟ "

میں چین سنگھ کی ضرب شدید کو ضرب خفیف میں تبدیل کر دونگا - دونوں بھائی بھائی ہیں - دونوں کی ضربیں خفیف رہیں گی تو ڈاکٹری رپورٹ کے بعد ـــــ صلح صفائی میں آسانی رہے گی -

" گویا اپنے ڈھنگ سے تم ایک نیک کام کر رہے ہو ؟ " ماں جی کے لہجے میں طنز کی ایک ہلکی سی چبھن تھی - مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اُن کے دل میں بھی ایک کشمکش تھی - نہ وہ تھیلی لینا چاہتی تھیں اور نہ واپس کرنا - کبھی اُن کا ہاتھ آگے بڑھتا تھا کبھی پیچھے ہٹتا تھا - عجب گو مگو کا عالم تھا پھر ماں جی جیسے اپنے آپ کو کوستے ہوئے بولیں - کاکے دے پتا - مجھ نتی کے لیے تو نے رشوت لے لی ـــــ ؟

مجھ پاپن کی جان بچانے کے لیے اس دیوتا سروپ آدمی نے رشوت لے لی جس نے آج تک کسی سے حرام کا ایک پیسہ نہ لیا تھا . . . . بھگوان !

ماں جی دیر تک سسکتی کراہتی اور اپنے آپ کو کوستی رہیں - مگر پتا جی پھر کچھ نہ بولے - ماں جی نے نوٹوں کی گڈیاں واپس تھیلی میں ڈال دیں اور اُنھیں اپنے سراہنے رکھ کر لیمپ کی بتی نیچی کر کے لیٹ گئیں - لیٹتے وقت اُنھوں نے میرے والد کی چارپائی کی طرف دیکھا مگر پتا جی نے لحاف اپنے مُنہ پر اوڑھ لیا تھا -

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ماں جی نے پوچھا ـــــ سو گئے ؟

نہیں! میرے والد نے اپنا مُنہ لحاف سے باہر نکالے بغیر جواب دیا۔

کیا سوچتے ہو۔؟ میری ماں نے پوچھا۔

میرے باپ نے ایک لمحے کے لیے اپنا آنسوؤں سے تربتر چہرہ لحاف سے باہر نکالا اور بولے۔ کاکے دی ماں! بہت سی مقدّس کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت آدم جو ہمارے پُرکھے تھے، جن سے ہماری نسل چلتی ہے، ایک بار خدا کے حکم سے نافرمانی کرنے پر جنت سے باہر نکالے گئے تھے۔ لیکن میں سوچتا ہوں صرف حضرت آدم ہی جنّت سے باہر نہیں نکالے گئے تھے بلکہ ہر انسان اپنی زندگی میں ایک بار جنّت سے باہر نکالا جاتا ہے۔

اتنا کہہ کر میرے والد نے پھر لحاف اوپر کر لیا۔ میں اُس رات اُن کا آنسوؤں سے بھرا چہرہ دوبارہ نہ دیکھ سکا۔

آج تقریباً نصف صدی کے بعد یہ لکھتے ہوئے وہی آنسوؤں بھرا چہرہ میرے سامنے آتا ہے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ میرے والد تو شاید ایک ہی بار جنت سے نکالے گئے تھے لیکن میں اور میرے ایسے ہزاروں لاکھوں کروڑوں لوگ ان گنت بار اِس زندگی میں جنت سے نکال کر دوزخ داخل کر دیئے جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں زندہ رہنے کا یہ کون طریقہ ہے اور میں خواب دیکھتا ہوں اور تمنّا کرتا ہوں شب و روز اُس نئی دنیا کی جس کی جنت بردوش پہنائیوں سے کبھی کوئی انسان باہر نکالا نہ جا سکے گا۔

۷

ایک روز میں اپنی ماں کے کمرے میں سے اپنی گیند لینے جا رہا تھا۔ کہ میں نے دروازے کی اوٹ سے اپنی ماں کو یہ کہتے سُنا ۔

" ہٹو ۔ مجھے مت چھوؤ " ماں کہہ رہی تھیں ۔

" کیوں نہ چھوؤں ؟ " یہ میرے پتا جی کی آواز تھی ۔

آج سنکرات ہے ۔

سنکرات ہے تو کیا ہُوا ؟

سنکرات میں نہیں چھُوتے ! ماں جی بولیں ۔

تو کل ؟ ــــــ میرے پتا جی نے پُوچھا ۔

کل ؟ ــــــ " کل تو باسن اوتار کا دن ہے ! "

"اچھا تو پرسوں؟"

اُون؟ ــــــ پرسوں؟ ــــــ پرسوں شاہ مُراد کی نیاز کا دن ہے!
بھول گئے۔ نیاز دینے کے لیے تمھیں بھی مزار پر چلنا ہو گا۔ میاں رمضانی کہہ
رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی مزار پر نہیں آتے!
کیوں ہے ــــ ارے ہٹو ہٹو ..... کہے دیتی ہوں۔ مجھے ہاتھ لگایا
تو مجھے دوبارہ اشنان کرنا پڑے گا!"

تھوڑی دیر کے بعد پتا جی کمرے سے باہر نکلے۔ مگر بے حد جھنّائے ہوئے
اور جھلّائے ہوئے۔ اچھا ہُوا میں دروازے کی اوٹ میں تھا۔ اُنھوں نے مجھے
نہیں دیکھا۔ ورنہ مجھ پر ضرور خفا ہوتے۔ ماں جی اور پتا جی ضرور اس بات پر
خفا ہوتے ہیں کہ بچوں کو بڑوں کی باتیں نہیں سُننا چاہیئے۔ یہ بات آج تک میری
سمجھ میں نہیں آئی۔ بڑے تو ہماری ہر بات سُن لیتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات
اس قدر کرید کرید کر پوچھتے ہیں۔ اور ہم جو کہیں سے دو باتیں سُن پائیں تو مار کھائیں!
پتا جی کے جانے کے بعد میں دوڑتا ہوا ماں کے کمرے میں گھس گیا۔ اور جاتے
ہی اُن کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگا۔

"ماتا جی۔ مَیں نے چھُو لیا! چھُو لیا! چھُو لیا!!! مَیں نے سوچا تھا ماں جی
خفا ہوں گی۔ جھلّائیں گی۔ اُونچا بولیں گی۔ مگر وہ تو کچھ نہ بولیں۔ وہ اپنی کپڑا سینے
کی مشین پر غلاف چڑھا رہی تھیں۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے لپٹتے دیکھ کر مسکرائیں۔
جھک کر اُنھوں نے مجھے اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ اور پیار کرتے ہوئے بولیں۔
"کاکا! تو نے ناشتہ کر لیا؟"

"ہاں ماں!"

"اور لال شربت بھی پی لیا؟"

"ہاں ماں!"

ماں نے مجھے دونوں گالوں پر چوما۔ پھر گود سے اُتار کر بولیں۔ "تو جاؤ۔ اب باہر باغ میں کھیلو"۔ ماں جی اس وقت مجھ سے خوش نظر آتی تھیں۔ مَیں نے سوچا۔ یہ موقع اچھا ہے۔ چنانچہ میں نے پُوچھ لیا۔

"ماں جی۔ ایک بات بتاؤ!"

"ہاں؟"

"مَیں نے تمھیں چھُوا تو تم کچھ نہ بولیں۔ پتا جی تم کو چھونے کو کہہ رہے تھے۔ تو تم ہٹو ہٹو کیوں کہہ رہی تھیں؟"

ماں جی کا مسکراتا ہوُا چہرہ ایک دم غصّے سے لال ہو گیا۔ وہ کھڑی تھیں۔ یکایک ایک کُرسی پر بیٹھ گئیں۔ اُنھوں نے مجھے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور مجھے زور زور سے ہلاتے ہوئے بولیں۔

"تم ہماری باتیں سُن رہے تھے؟ بدمعاش؟"

میں سہم گیا۔ مگر ماں جی مجھے برابر غصّے میں اس طرح ہلا رہی تھیں۔ جس طرح پتا جی دوا پلاتے وقت دوا کی شیشی زور زور سے ہلاتے ہیں۔ مَیں نے کانپ کر اقبال کیا۔

"ہاں میں دروازے کی اوٹ میں تھا۔ مگر میں نے سُنا نہیں۔ ہاں وہ تو خود سے میرے کانوں میں پڑ گیا۔ مَیں تو اپنی گیند لینے . . . .

مگر ماں نے آگے کا فقرہ مکمل ہونے نہیں دیا۔ تڑاخ تڑاخ دو تین چار طمانچے میرے رخساروں پر پڑے۔

"تجھے دس بار کہا ہے۔ بڑوں کی باتیں مت سُنو۔ مت سُنو۔ مت سُنو تو بھی نہیں مانتا ہے۔ ایں؟ (ایک طمانچہ) ایں؟ (دوسرا طمانچہ) ایں؟ (تیسرا طمانچہ) ڈھیٹ سُؤر......!

بجانے مجھے ابھی اور کتنے طمانچے پڑتے۔ اگر اُسی وقت کمرے صاف کرنے والی بیگم بھاگی بھاگی اندر نہ آتی۔ اُس نے دوڑ کر زبردستی مجھے میری ماں سے چھین لیا اور بولی۔

"اب کیا اسے مار ہی ڈالو گی؟ تمہارا غصّہ تو اندھے کا غصہ ہے مالکن! مارتے وقت آگا پیچھا کچھ نہیں دیکھتی ہو۔

بیگم نے میرے آنسو پونچھے۔ میرا مُنہ دھویا۔ میرا مُنہ چوما۔ مجھے اپنے گُدگُدے سینے سے لگایا۔ اور جب میری سسکیاں بند ہوگئیں۔ تو وہ بنگلے کے پچھواڑے کی طرف لے گئی۔ جہاں پالتو کبوتروں کی چھتری تھی۔ بیگم نے ایک کبوتر پکڑ کر میرے ہاتھ میں دیا۔ اور بولی۔

"لو اب اس سے کھیلو!" یہ کہہ کر وہ مجھے پچھواڑے میں چھوڑ کر کام کرنے کے لیے چلی گئی۔

میں کچھ دیر تک تو کبوتروں سے کھیلتا رہا۔ پھر بلّی کے بچّوں سے کھیلتا رہا مجھے معلوم نہیں میں کب تک کھیلتا رہا۔ یکایک میں نے محسوس کیا۔ جیسے بنگلے سے باہر لکڑی کے جنگلے سے دو بڑی بڑی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ میں نے

سر اُٹھا کر اچھی طرح سے دیکھا۔ وہ بڑی خوبصورت تھی۔ اُس کا رنگ تابنے کا سا تھا۔ آنکھیں گہری سبز تھیں۔ بال اُلجھے اُلجھے سے تھے۔ اُس نے لال سُوسی کی ایک تنگ قمیض پہن رکھی تھی۔ جس میں اُس کی چھاتیاں بہت اُبھر آئی تھیں اور ان چھاتیوں پر چاندی کی زنجیریں اور رنگ برنگ منکوں کی مالائیں پڑی تھیں اُس کے کان میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں تھیں۔ جب وہ بات کرتی تھی تو وہ بڑے مزے سے جھومتی تھیں۔ اور کبھی کبھی اُس کے رُخسار سے بھی لگ جاتیں۔ کیونکہ وہ بالیاں بہت ہی بڑی تھیں۔ اور جب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور ہنسی تو مجھے اُس کے دانت شوتی کی کلیوں کی طرح بالکل چھوٹے چھوٹے اور بے انتہا سفید معلوم ہوئے۔ ایسے سفید دانت میرے بھی نہیں ہیں۔ حالانکہ ماں جی مجھے دن میں دو بار برش کرواتی ہیں!

لال سُوسی کی قمیض کے نیچے اُس نے ایک گھیرے دار لہنگا پہن رکھا تھا۔ جس پر کئی رنگ کا کپڑا اور کئی طرح کا کپڑا لگا ہُوا تھا۔ اور کئی جگہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں لگا ہُوا تھا۔ مگر اُس کے پاؤں ننگے تھے۔ اُس کے پاؤں میں جُوتا نہیں تھا۔ اور اُس نے اپنے کندھے پر دو ٹوکریاں لٹکا رکھی تھیں۔

جب وہ میری طرف دیکھ کر مُسکرائی۔ تو میں نے اُس سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

جنگلے کے باہر کھڑے کھڑے اُس نے اپنے بائیں پاؤں سے اپنا دایاں پاؤں کھجایا۔ اور بولی ——— "میں سپیرن ہوں۔ میرے پاس بہت عُمدہ عُمدہ سانپ ہیں۔ دیکھو گے؟"

"ہاں دیکھوں گا۔" میں نے خوش ہوکر کہا۔ پھر فوراً ہی مایوس ہوکر کہا: "مگر تمھارے پاس تو بین بھی نہیں ہے!"

"ہے! کیوں نہیں ہے؟" سپیرن اپنا کندھا جھٹک کر بولی۔ اور بیٹھ پر لٹکی ہوئی بین سامنے آگئی۔

"یہ دیکھو!"

مَیں نے خوشی سے دونوں ہاتھوں سے تالی مار کر کہا: "پہلے تم مجھے بین بجا کر دکھاؤ۔"

وہ بولی: "نہیں پہلے تم مجھے ایک آنہ دو!"

میرا دل اِکدم سے بیٹھ گیا: "ایک آنہ تو میرے پاس نہیں ہے!" میں نے بالکل مایوس ہوکر کہا۔

"تو اپنی ماں سے مانگ لاؤ۔"

"وہ نہیں دیں گے۔ وہ مجھے سانپ بھی نہیں دیکھنے دیں گی۔ اُنھیں سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے!"

"تو اپنے باپ سے مانگ لاؤ!" سپیرن نے مجھے سمجھایا۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" یکایک میرا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا اور میں چھلانگ مار کر لکڑی کے جنگلے سے کود کر سپیرن کے پاس چلا گیا: "چلو مَیں تمھیں پتا جی سے ایک آنہ لے کے دیتا ہوں۔"

مَیں باغ کی روشوں پر دوڑتا دوڑتا سپیرن کے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ راستے میں مجھے پتا جی مل گئے۔ جو ہسپتال سے واپس آ رہے تھے۔ اور مویشی

خانے کے قریب کھڑے ہو کر مالی سے بات کر رہے تھے۔ جو سونف کی جھاڑیوں کے ایک بہت بڑے جھُنڈ کے قریب اپنی کھُرپی چلا رہا تھا۔ سونف کا جھُنڈ مجھ سے قد میں دُگنا ہوگا۔ پتاجی اُس جھُنڈ کے دوسری طرف تھے۔ اور ہم لوگ اس طرف تھے۔ اس لیے مجھے پتاجی نے آتے ہوئے نہ دیکھا۔ اُنھوں نے صرف اتنا دیکھا کہ اُلجھے اُلجھے سیاہ بالوں کے ہالے میں گہری سبز آنکھوں والا ایک چہرہ سونف کی لٹکتی ہوئی ٹہنیوں پر پھسلتا ہُوا اُن کے سامنے چلا آ رہا ہے۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ بولے۔

"تم کون ہو؟"

"میں سپیرن ہوں!"

"یہ کام تو مردوں کا ہے!"

"میرا باپ سپیرا تھا۔ جب وہ مر گیا۔ تو مَیں نے یہ کام سنبھال لیا۔"

"کیوں تمھارا کوئی بھائی نہیں ہے؟"

"نہیں۔ صرف ایک اندھی ماں ہے! اور بہت بوڑھی ہے!"

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ سپیرن مجھے شاید بھول بھی چکی تھی۔ شروع میں میرا ارادہ دخل دینے کا تھا۔ اور چیخ کر اپنی موجودگی جتانے کا بھی تھا۔ مگر جب دو بڑوں میں گفتگو شروع ہو جائے۔ تو اُس میں بچوں کا دخل دینا اچھا نہیں ہوتا۔ اور ابھی ابھی مَیں اپنی ماں سے پٹ بھی چکا تھا۔ مگر ان لوگوں کی باتیں بہت دلچسپ تھیں۔

تھوڑی دیر چُپ رہنے کے بعد میرے پتاجی مسکرائے۔ بولے۔

"تم سانپ پکڑ سکتی ہو؟"

سپیرن نے بے خوف نگاہوں سے اُنھیں تاکتے ہوئے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا!

"ناگ بھی؟" پتاجی شریر نگاہوں سے اُسے تاکتے ہوئے بولے۔

سپیرن مسکرائی۔ ہنس کر بولی "بڑے سے بڑا ناگ بھی میری بین کی آواز سُن کر چھپا نہیں رہ سکتا۔ مست ہو کر میری بین پر جھومنے لگے گا!"

"ہمارے باغ میں بہت سے سانپ رہتے ہیں۔ کیا وہ تم سب پکڑ لوگی؟"

"سب پکڑ لوں گی! مگر تم دو گے کیا؟"

میرے پتاجی خاموش کھڑے رہے۔ دیر تک اُسے دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"اور اگر میں تمھیں کچھ نہ دُوں تو—!"

سپیرن نے دیر تک میرے پتاجی کی طرف دیکھا۔ وہ اُن کے بالکل قریب آگئی۔ اُس کی سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر میرے والد کی بڑی بڑی بے خوف آنکھوں مضبوط اور وجیہہ چہرے کو دیکھ کر وہ کچھ گھبرا گئی۔ یکایک اُس نے آنکھیں نیچے جُھکا لیں۔ آہستہ سے کمزور آواز میں بولی۔ اچھا!

جس طرح سے اُس نے "اچھا" کہا۔ وہ مجھے بہت بُرا معلوم ہُوا۔ مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے اُس کی آواز اور ہی ہو۔ اور کراہ رہی ہو۔ جیسے دُور سے باغ میں کوئی انجانی ہوا آئی تھی۔ اور سسکیاں لے کر چلی گئی۔ کبھی کبھی دوپہر میں

ہمارے باغ میں بالکل اسی طرح ہوا روتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے مالی سے کئی بار اس کی وجہ پوچھی ہے۔ مگر وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ کہتا ہے۔ یہ تمہارا وہم ہے۔ کاکا! ہوا تو بس ہوا ہے۔ وہ نہ روتی ہے نہ گاتی ہے۔ وہ تو بس درختوں کے پتوں کو چھیڑتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

مگر اس وقت ہوا نے نجانے کس کو چھیڑا تھا؟

میرے پتاجی بولے "تم کہاں رہتی ہو؟"

"آج ہی تو یہاں آئی ہوں۔ ابھی رہنے کا ٹھکانا کہیں نہیں بنایا۔ ویسے میں اپنی ماں کے ساتھ بالے پور کے گاؤں میں رہتی ہوں۔"

"تم اکیلی گھومتی ہو۔ تمھیں مردوں سے ڈر نہیں لگتا؟"

سپیرن بولی "میرے سانپ میری حفاظت کرتے ہیں۔ مجھے نہیں! مردوں کو مجھ سے ڈر لگتا ہوگا!"

ہمارے باغ میں ایک ناگ ہے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا!" میرے باپ نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"کہاں رہتا ہے وہ؟ مجھے اُس کی بل بتا دو۔ یا رہنے کی جگہ دکھا دو۔ میں اُسے پکڑ لوں گی۔ میری بین میں ایسا جادو ہے۔ جس سے بڑے سے بڑا ناگ بھی نہیں بچ سکتا!"

میرے پتا بولے "میں مالی سے کہے دیتا ہوں۔ وہ تمھیں اپنے گھر رکھے گا۔ اور تم جب تک ہمارے باغ کے سانپ پکڑو گی اُس کے گھر میں رہو گی۔ اور میں تمھیں ایک سانپ پکڑنے پر ایک اٹھنی دیا کروں گا۔ مگر خبردار تم ہمارے باغ

کے ناگ کے بل پر مت جانا! اُس کے کاٹے کا منتر نہیں ہے!"

"جاؤ! جاؤ!!" سپیرن اپنی چھوٹی سی زبان نکال کر میرے باپ کو چڑاتے ہوئے بولی۔ پھر اُس نے اپنی بین اُن کے سامنے جھلائی اور بولی۔ "بتاؤ تو سہی کدھر ہے وہ تمہارا ناگ؟"

"چلو تمہیں دکھاؤں!"

پتا جی کو تو خیر معلوم نہ تھا۔ کہ میں سونف کے جھنڈ کے اُس طرف سپیرن کے اس قدر قریب کھڑا ہوں۔ مگر سپیرن کیوں مجھے بھول گئی تھی۔ وہ میری طرف سے بالکل انجان ہو کر میرے پتا کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ میں بھی ذرا فاصلہ رکھ کر اُن کے پیچھے پیچھے پیڑوں کی اوٹ میں چلنے لگا۔

چیری کے درختوں سے گذر کر وہ لوگ آڑوؤں کے جھنڈ میں پہنچے۔ وہاں سے گذر کر اخروٹ کے درختوں کے قریب ایک چھوٹے سے ٹیلے پر جا کر رُک گئے۔ میرے پتا بولے۔ "وہ ناگ یہاں رہتا ہے!"

"اِس ٹیلے کے اندر"

"ہاں! کہتے ہیں۔ اس ٹیلے کے اندر سیداں بی کی قبر ہے"

"سیداں بی کون تھی؟!"

یہ تو کوئی نہیں جانتا۔ سیداں بی کون تھی۔ مگر لوگ کہتے ہیں وہ بڑی خوبصورت تھی۔ یہ اُن دنوں کا ذکر ہے۔ جب یہاں پر نہ یہ باغ تھا۔ نہ ہسپتال تھا نہ راجہ جی کا محل تھا۔ اُن دنوں مغل بادشاہ کا ایک قافلہ اُدھر سے گذرا تھا۔ اور سیداں بی ایک مغل شہزادے پر عاشق ہو گئی تھی۔ وہ مغل شہزادہ اپنے باپ سے بھاگ کر یہاں

آیا تھا۔ اور چھ ماں سیداں بی کے گھر میں رہا تھا۔"

"پھر؟"

"چھ ماہ کے بعد مغل شہزادے کو شاہی دربار سے پیام آیا۔ اُس کے باپ نے اُسے معاف کر دیا تھا۔ اور اب وہ اُسے واپس بُلا رہا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر مغل شہزادہ چلا گیا۔ اور سیداں بی سے کہہ گیا۔ کہ وہ اُسے شاہی دربار سے بُلا بھیجے گا۔ سیداں بی زندگی بھر مغل شہزادے کے بلاوے کا انتظار کرتی رہی۔ . . . . . یہاں پر وہ دفن ہے!"

سپیرن کچھ نہ بولی۔ وہ جُھک کر اور پاؤں پسار کر ٹیلے کے قریب بیٹھ گئی اُس نے ٹوکریاں کندھے سے اُتار کر الگ رکھ دیں۔ اور آنکھیں بند کر کے بین بجانے لگی۔

سچ مچ اُس کی بین کی آواز بڑی من موہنی تھی۔ جیسے وہ بین رو رو کر پکار رہی ہو۔ بُلا رہی ہو۔ جیسے وہ بین زخمی ہو۔ اور مرہم چاہتی ہو۔ جیسے وہ ایک بھولا ہُوا بچہ ہو۔ اور راستہ پُوچھتا ہو۔ کدھر؟ کدھر؟

وہ دیر تک بین بجاتی رہی۔ مگر میں نے دیکھا۔ اُس کے بین بجانے پر بھی کوئی ناگ ٹیلے سے باہر نہیں نِکلا۔ ہاں میرے باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے!

(۲)

"اُدھر مالی کے گھر میں ایک سپیرن آئی ہے!" میں نے اپنی ماں سے کہا۔

"سپیرن؟"

ہاں سانپ پکڑنے والی سپیرن - پتاجی نے اُسے نوکر رکھا ہے۔ ایک سانپ پکڑنے پر اُسے آٹھ آنے ملیں گے !"

" مگر تیرے پتانے تو مجھے بالکل نہیں بتایا۔۔۔۔" پھر وہ جلدی سے بولیں - اچھا چل دکھا مجھے۔ کدھر ہے وہ سپیرن؟"

میں ماں کو مالی کے گھر لے گیا۔ مالی کا گھر مٹی کا تھا۔ اور اُس میں صرف دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک کوٹھڑی میں سپیرن اپنے بال کھولے ایک ٹوٹا آئینہ اپنے سامنے رکھے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ جب اُس نے میری ماں کو اپنے سامنے دیکھا۔ تو کنگھی کرتے کرتے رُک گئی۔ اُس کی گہری سبز آنکھیں یکایک یوں چمک اُٹھیں جیسے کوئی ندی کے گہرے پانی میں زور سے پتھر پھینک دے! پھر اُس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔۔۔۔۔

میری ماں اُسے ایک نظر دیکھ کر اُلٹے قدم لوٹ آئی۔ باہر آکر مالی سے بولی جو اپنی بیمار بیوی کے پاؤں داب رہا تھا۔

"ارے یہ سانپ کیا پکڑے گی؟ یہ تو خود ناگن ہے ناگن !"

میری ماں کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ماں اُس کو ناگن کیسے کہہ رہی تھیں۔ سپیرن تو بالکل میری ماں کی طرح ایک عورت تھی۔ وہ ناگن کیسے ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے یہ بڑے لوگ کبھی کبھی انتہائی حماقت کی باتیں کر جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے اپنی ماں سے کہدیا۔

" مگر وہ تو ایک عورت ہے۔ جس طرح دوسری عورتیں ہیں۔ اُس کو تم نے ناگن کیسے کہدیا؟"

"تم نہیں سمجھتے۔" میری ماں تنک کر بولیں۔ "اور تم سے کس نے کہا ہے۔ کہ بڑوں کی باتوں میں بولا کرو۔ میں تم سے دس بار کہہ چکی ہوں۔ بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔ ورنہ........!"

میں چپ ہو گیا۔ اور سہم کر ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ ماں جی مجھے جلدی جلدی چلا کر بلکہ تقریباً" دوڑا کر واپس بنگلے میں لے گئیں۔

رات کو جب میری ماں نے سمجھا کہ اب میں گہری نیند سو چکا ہوں، حالانکہ میں جاگ رہا تھا۔ اور محض آنکھیں بند کر کے بستر میں دبکا پڑا تھا۔ اُس وقت میری ماں میرے پتا جی سے لڑنے لگیں.......

"اُس جنم جلی سپیرن کو تم نے نوکر رکھا ہے؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"سانپ مارنے کے لیے۔"

"تو اس کام کے لیے کوئی سپیرا نہیں ملتا تھا؟"

"نہیں ملا ناں۔ جبھی تو اُس کو رکھا ہے!"

"میں نہیں مانتی۔"

"نہیں مانتی تو تم خود سپیرا لا دو۔ مَیں اسے نکال کر اُسے رکھ لوں گا۔"

"کسی سپیرے یا سپیرن کی ضرورت ہی کیا ہے؟ مَیں نے تو نہیں دیکھا باغ میں کسی سانپ نے آج تک کسی کو کاٹا ہو۔"

"کاٹا نہ ہو۔ مگر کاٹ تو سکتا ہے!"

"یہ سب تمہاری فضول باتیں ہیں۔ مَیں سب سمجھتی ہوں۔ وہ سپیرن کل یہاں سے جائے گی۔"

"وہ نہیں جائے گی۔"

"وہ جائے گی۔"

"نہیں جائے گی۔"

"میں اُس کو جھاڑو مار کر نکال دوں گی۔" میری ماں یہ کہتے کہتے رونے لگیں۔

"پگلی ہوئی ہو۔" میرے پتا خفا ہو کے بولے۔ "چند روز کی بات ہے۔ جب وہ باغ کے سانپ پکڑ لے گی۔ خود ہی چلی جائے گی۔ دن بھر تمہارا بچہ باغ میں کھیلتا رہتا ہے۔ مَیں جو کچھ کر رہا ہوں اُس کے بھلے ہی کے لیے کر رہا ہوں!"

یہ سُن کر یکایک میری ماں روتے روتے چُپ ہو گئیں۔ جیسے اُن کے دل کو یقین آ چلا ہو۔ بولیں۔ "سچ کہتے ہو؟" اُن کے لہجے میں آدھا شک تھا۔ آدھا یقین تھا۔

پتا جی نے میری ماں کے آنسو پونچھے اور اُنھیں پیار کر کے کہا۔

"پگلی اِس قدر نادان نہ بن۔ کیا تجھے ابھی تک میری محبت کا یقین نہیں ہے؟"

میری ماں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ کروٹ بدل کر میرے باپ کی باہنہ پر سو گئیں۔

مگر اُس دن کے بعد اُنھوں نے پھر پتا جی سے لڑائی شروع کر دی۔ ہوا یہ تھا کہ ماں جی نے میرے پتا کو سیداں کے ٹیلے کے پیچھے کھُسر پھُسر کرتے دیکھ لیا تھا۔ اُن کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ اب وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھیں۔

کریا تو اب میں یہاں رہوں گی ۔ یا وہ سبز آنکھوں والی ناگن رہے گی ! اور پتا جی کہہ رہے تھے ۔ آہستہ بات کرو ۔ آہستہ بات کرو ۔ بچہ سُن لے گا ۔ بچہ جاگ جائے گا ۔

اور ماں جی کہنے لگیں ۔ جاگ جائے بچہ ۔ سُن لے بچہ ۔ میرا بچہ کیا سارا جہان سُن لے ۔ تمھارے ایسا بے وفا مرد اس دُنیا میں کوئی نہ ہوگا ۔ مجھے میرے میکے بھیج دو ۔ میں یہاں ایک پل کے لیے نہیں رہوں گی ۔ اگر وہ کل مُونہی یہاں سے نہیں جائے گی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی ۔"

"ان تین دنوں میں اُس نے باغ میں سے بیس سانپ پکڑے ہیں !"

"بیس پکڑے یا پچاس پکڑے ۔ مَیں کل اُس کی چُٹیا پکڑ کر اُسے اپنے احاطے سے باہر پھینک دوں گی !"

"تمھارے جیسی شکّی عورت مَیں نے نہیں دیکھی ۔ خواہ مخواہ کا شبہ کرنے لگ جاتی ہو ۔"

"تو تم اُس کو یہاں رکھ کر میرا شبہ کیوں مضبوط کرنا چاہتے ہو ؟" میری ماں غصّے سے چلائی ۔

"اچھا بابا ۔ اچھا بابا ۔ مَیں ہارا تو جیتی ۔ میں اُس کو ایک ہفتے کے بعد نکال دوں گا ۔ اس ایک ہفتے میں جتنے سانپ وہ باغ میں سے نکال سکتی ہے اُسے نکال لینے دے ۔ اس بیچ میں اُس سے جھگڑا مت کر ۔ اپنے دل کو ہلکان مت کر ۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں ۔ تیرے بچے کی حفاظت کے لیے کر رہا ہوں !"

"اچھا تو بس ایک ہفتہ !"

"ہاں بس ایک ہفتہ!"

"اور اُس سے اُوپر ایک دن نہیں۔"

"ایک لمحہ نہیں!" میرے باپ نے میری ماں کو اپنے بازوؤں میں لیکر کہا۔ میں نے ایک آنکھ آہستہ سے کھولی اور پھر فوراً بند کرلی۔ میری ماں اطمینان کا سانس لے کر بولیں۔

"جب تم اس طرح بات کرتے ہو۔ تو میرے دل کو یقین آجاتا ہے۔!"

میر والد نے سپیرن سے کہد یا تھا۔ کہ سات دن کے بعد اُسے یہاں سے چلے جانا ہوگا۔ اتنے دنوں میں وہ جتنے سانپ پکڑ سکتی ہے پکڑے سپیرن اُن کی بات سُن کر چپ ہوگئی تھی۔ اُس نے ایک بار غور سے میرے باپ کی طرف دیکھا تھا۔۔۔ مگر وہاں اپنے مطلب کی کوئی بات نہ پاکر وہ مایوس ہوگئی تھی۔ اور چُپ چاپ مُنہ موڑ کر سیداں بی کے ٹیلے کی طرف چل دی اور وہاں پاؤں پسار کر زور زور سے بین بجانے لگی۔ آج اُس کی بین میں مٹھاس نہ تھی۔ مستی نہ تھی۔ دُکھ نہ تھا۔ درد نہ تھا۔ صرف غم و غصہ تھا۔ کچھ ایسی بے چین لہر اور تڑپ تھی۔ جیسے ڈنک سے خالی ناگن بل کھا کھا کر زہر مانگ رہی ہو!

ساتویں دن جس دن سپیرن جانے والی تھی۔ اُس دن میری ماں کو ایک سانپ نے کاٹ کھایا۔ میری ماں برآمدے کی دیوار سے لگی عشق پیچاں کی بیل کو پانی دے رہی تھیں۔ کہ اُن کے پاؤں کے نیچے جانے کہاں سے ایک سانپ آگیا اور اُس نے فوراً انھیں ٹخنے سے اُوپر کاٹ کھایا۔ میری ماں اُس دن چیخ کر

گر پڑی۔ اور آہستہ آہستہ نیلی ہوتی گئیں۔ امریک سنگھ باورچی نے اُسی وقت کَس کر رسّی سے دو جگہ بازوٗں باندھ دیا۔ اور بھاگ کر پتا جی کو بُلا لایا۔ پتاجی نے آتے ہی جہاں پر سانپ نے کاٹ کھایا تھا وہاں پر نشتر سے شگاف کر کے بہت سا خون بہا دیا۔ اور زخم میں پوٹاشیم پرمینگ سینٹ بھر دیا۔

ان دنوں وہاں پر سانپ کے زہر کے انجکشن نہ ملتے تھے۔ اور بس میرے پتا سانپ کے کاٹے کا یہی علاج کرتے تھے۔ جس سے کبھی تو مریض بچ جاتے تھے اور اکثر اوقات مر جاتے تھے۔

میری ماں بے ہوش تھیں۔ اور نیلی پڑتی جا رہی تھیں۔ اور اُن کے مُنہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔ اور مَیں اُنھیں دیکھ دیکھ کر رو رہا تھا....

یکایک میرے پتا جی وہاں سے اُٹھے اور سیدھے مالی کے گھر گئے۔

اُس وقت سیبرن اپنا سامان باندھ چکی تھی۔ آج اُس نے اپنا لہنگا اور قمیض دونوں دھو کر صاف ستھرے کر لیے تھے۔ بالوں میں کنگھی کی تھی۔ ندی کی نرم ریت سے رگڑ رگڑ کر اپنے چاندی کے زیور چمکا لیے تھے۔ اخروٹ کی چھال سے اپنے ہونٹ سُرخ کئے تھے۔ اور بالوں میں گلاب کا ایک بہت بڑا پھول لگا رکھا تھا۔ اور اب وہ بالکل جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

"رانو چلو!"

"کہاں؟"

"وہ مر رہی ہے۔ اُسے بچا لو۔"

"نہیں۔ اُسے مرنے دو!"

"نہیں رانو۔ مانو۔ اُسے بچالو۔ میری دوا کام نہیں کر رہی ہے"!

"میرے پاس کوئی دوا نہیں ہے۔ میں سانپ پکڑتی ہوں۔ سانپ کا زہر دُور نہیں کر سکتی!"

"تم دُور کر سکتی ہو۔ تم نے خود مجھے بتایا تھا۔ کہ تمھارے پاس سانپ کے کاٹے کی بہترین دوا ہے!"

"وہ میں نے کہیں کھو دی ہے!" سپیرن منہ موڑ کر بولی۔ اُس کے لہجے میں انتہائی سختی اور بیزاری تھی......

میرے پتا جی نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اور روتے ہوئے کہا۔ "نہیں رانو مانو۔ اُسے بچالو۔ کسی طرح سے بھی بچالو۔ اگر وہ مر گئی۔ تو میں بھی زندہ نہ رہوں گا۔!"

سپیرن نے پلٹ کر میرے باپ کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے بولی "اُس کے لئے تم روتے ہو۔ اور میرے لیے تمھارے پاس ایک آنسو بھی نہیں ہے!"

میرے باپ نے سر جھکا لیا۔ وہ چُپ چاپ سپیرن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ خاموش۔ مجرم کی طرح!

سپیرن نے ایک آہ بھری۔ اُس نے اپنی دونوں ٹوکریاں اٹھائیں اور بولی ـــــ "جو تم چاہتے ہو وہی ہو گا!"

وہ میرے باپ کے ساتھ میری ماں کے بستر پر آئی۔ اُس نے میری ماں کے زخم سے اپنے ہونٹ لگا دیئے۔ اور اپنے ہونٹوں سے چوس چوس کر زخم کا بہت سا خون باہر تھوک دیا۔ پھر اُس نے اپنے جھولے کو ٹٹول کر اُس میں سے ایک کالی سی

ڈبیا نکالی۔ اور اُسے کھول کر اُس میں سے ایک سبز رنگ کی مرہم زخم پر لگائی۔ اُس کے بعد وہ باغ میں دوڑی دوڑی گئی اور دیر تک کچھ تلاش کرتی رہی۔ آخر ایک ڈھلّی کے کنارے سے وہ ایک بڑے بڑے لمبوترے پتّوں والا ایک پودا اُکھاڑ لائی۔ اور اُن پتّوں کو ایک کھرل میں کُوٹ کر اُن کا رس نکال کے میری ماں کے ہونٹوں میں ٹپکانے لگی۔ دو گھنٹوں کے بعد میری ماں کے مُنہ سے جھاگ نکلنا بند ہو گیا۔ پھر دھیرے دھیرے بدن کا نیلاپن دُور ہوتا گیا۔ پھر دھیرے دھیرے میری ماں نے آنکھیں کھولیں۔ اور جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو بسیرن آہستہ سے پرے ہٹ گئی۔ اور میرے پتاجی آگے آ گئے۔ اور انھوں نے بڑے پیار سے میری ماں کا چہرہ اپنے زانو پر رکھ لیا اور پوچھا۔

اب کیسی ہو؟

میری ماں نے کمزور آواز میں کہا ——— "معلوم ہوتا ہے بچ جاؤں۔ میرا لال کہاں ہے؟"

میں روتا روتا اپنی ماں کے گلے سے لگ گیا۔ تھوڑی دیر میں مَیں، ماں اور باپ ہم تینوں خوشی کی سسکیاں بھر رہے تھے . . . .

یکایک میرے والد کو کچھ یاد آیا۔ انھوں نے کہا "جانکی؟ تمھیں معلوم ہے تمھاری جان کس نے بچائی ہے؟"

ماں نے خاموشی سے انکار میں سر ہلایا۔ میرے باپ نے پلٹ کر بسیرن سے کہا۔

"زانو آگے آؤ۔"

مگر جب میرے باپ نے پلٹتے ہوئے یہ فقرہ کہا۔ اُس وقت وہاں کوئی نہ تھا سپیرن جا چکی تھی۔

سپیرن پھر کبھی لوٹ کے ہمارے علاقے میں نہیں آئی۔ ہاں سردی کی راتوں میں جب چاروں طرف برف پڑ جاتی ہے۔ ندی کے اُس پار سے بین کی تڑپتی ہوئی صدا آتی ہے۔ جسے سُن کر میرے والد اپنے کمرے سے باہر نکل آتے ہیں اور بے چین ہو کر برآمدے میں ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور وہ آواز دُور ندی کے پانیوں سے پرے ہوا کے دوش پر لرزتی ہوئی اس طرح آتی ہے۔ جیسے ویران برف زاروں میں کوئی بالک کھو جائے اور بلک بلک کر اپنا راستہ پوچھے۔....؟

۸

ایک روز خبر آئی کہ مجا ڈاکو مارا گیا ہے اور پولیس والے اُس کی تلاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال میں لارہے ہیں۔

مجے نے ایک عرصے سے ریاست کی سرحدی تحصیل فتح گڑھ میں بغاوت پھیلا رکھی تھی اور راجہ جی نے اُس کی لوٹ مار سے تنگ آکر اعلان کر دیا تھا کہ جو کوئی شخص مجا کا سر کاٹ کر اُن کے دربار میں پیش کرے گا اُسے دس ہزار روپیہ نقد، خلعت اور جاگیر انعام میں دی جائے گی۔ فتح گڑھ کا سردار موسیٰ خاں ایک عرصے سے مجے کی تاک میں تھا۔ اور چاروں طرف اُس نے اپنے آدمی اس کام کے لیے پھیلا رکھے تھے۔ ایک روز آدھی رات کے قریب جب مجا فتح گڑھ کے قلعے کے نیچے سردار موسیٰ خاں کے گاؤں کے قریب سے گزر رہا تھا

موسیٰ خاں نے اُس کی پیٹھ میں چھ گولیاں مار کر اُسے ہلاک کر دیا۔ اور اب وہ فجے کی لاش کو اُٹھوا کر اپنے حمایتیوں اور شناختی گواہوں کے ہمراہ صدر مقام پر آیا تھا تاکہ خلعت، جاگیر اور دس ہزار روپیہ نقد حاصل کر سکے۔

سردار موسیٰ خاں اپنی کارکردگی پر بہت خوش تھا۔ کیونکہ فجے نے جس کا اصلی نام فیض محمد خاں تھا، ایک عرصے سے فتح گڑھ اور دوہالہ کے علاقے میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔ فتح گڑھ کا علاقہ راجہ کی ریاست میں اور دوہالے کا علاقہ انگریزی عملداری میں شامل تھا۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ آج سے ایک سو سال پہلے اِن دونوں علاقوں پر گکھڑوں کی حکومت قائم تھی جو ان علاقوں میں آباد تھے۔ لیکن اس آزاد ریاست کو ایک طرف سے انگریزوں نے اور دوسری طرف راجہ جی کے دادا نے حملہ کر کے ختم کر دیا تھا۔ گکھڑ اس دو طرفہ لڑائی کی تاب نہ لا سکے اور جرأت اور بہادری اور جی داری سے لڑنے کے باوجود ہار گئے۔ لیکن ہارنے کے باوجود یہ امر ایک حقیقت ہے کہ یہ علاقہ آج تک کبھی پوری طرح سے مطیع نہ ہو سکا۔ کیونکہ گکھڑ بڑے جنگجو خودسر اور آزادی پسند واقع ہوئے ہیں۔ اُن کے علاقے میں آج تک ہمیشہ کبھی نہ کبھی کوئی بغاوت ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے سرکار انگلشیہ نے دوہالے کے مقام پر ایک بہت بڑی چھاؤنی قائم کی تھی اور اِدھر ریاستی علاقے میں راجہ جی کی ایک تہائی فوج فتح گڑھ کے قلعے اور کوٹ بلیر خاں کی گڑھیوں میں گکھڑوں کی سرکوبی کے لیے ہمیشہ موجود رہتی تھی۔

فجا اپنے علاقے کے لوگوں میں کسی طرح کی لوٹ مار نہ کرتا تھا۔ پہلے تو وہ

دوہالے کے علاقے میں اپنے باغ گکھڑوں کے ہمراہ پولیس کی چوکیوں پر حملہ کرتا رہا۔ لیکن جب انگریزی پولیس نے اُس کا ناطقہ بند کر دیا۔ اور چاروں طرف اپنے مخبروں کا جال پھیلا دیا تو فجا دریائے سَون کو پار کر کے ریاست کی عملداری میں داخل ہو گیا اور فتح گڑھ کے علاقے میں اپنی سرگرمیوں کو پھیلانے لگا پہلے تو دوہالے کے ڈپٹی کمشنر نے اُس کی گرفتاری کے لیے پانچ ہزار کا انعام رکھا تھا۔ لیکن جب ریاست میں آکر فجے نے ایک دن فتح گڑھ تحصیل کے خزانے کو دن دہاڑے لُوٹ لیا تو اِس واقعے کے بعد راجہ جی بھی اُس کی جان کے دشمن ہو گئے۔ اور اُنھوں نے اُس کے سر کے لیے دس ہزار کا انعام رکھ دیا۔ لیکن اِس انعام رکھنے کے ڈیڑھ سال بعد بھی فجا کسی کے ہاتھ نہ آیا اور بدستور اپنے دلیرانہ حملوں میں مصروف رہا۔ یوں بھی دوہالے اور فتح گڑھ کے علاقے میں کسی ڈاکو کو پکڑنا آسان نہیں ہے۔ یہ علاقہ سخت دشوار گزار، بنجر ویران اور پُرپیچ سنگلاخ پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ جہاں ننگی چٹانوں اور سنٹھے کی جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ پانی کمیاب ہے۔ بارش کم ہوتی ہے۔ صرف کہیں کہیں اِکاّ دُکاّ وادیوں میں جوار باجرے یا مکئی کی فصل ہوتی ہے۔ لوگ بے حد غریب اور جفاکش ہیں اور اپنی غریبی کے باوجود اپنے علاقے کی آزادی پر جان دیتے ہیں۔ ہر گاؤں میں پوشیدہ طور پر بندوقیں تیار ہوتی ہیں۔ اور غیر قانونی طور پر انگریزی علاقے میں بھیجی جاتی ہیں اور یہی اُن لوگوں کی سب سے بڑی تجارت ہے۔

فجا کوٹ بلیر خاں کا رہنے والا تھا۔ اور ایک لوہار کا بیٹا تھا اور بندوق کی

دو نالیاں بے حد عمدہ تیار کرتا تھا۔ اُس کے ہاتھ کی بنی ہوئی بندوقیں دُور
دُور تک جاتی تھیں۔ اس تجارت کے سِلسلے میں وہ ایک بار دوہالے کے قریب
اپنی بندوقیں بیچتا ہوا پکڑا گیا۔ اور تین سال کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ مگر
فجا بے حد ذہین اور سرکش طبیعت کا مالک تھا۔ ڈیڑھ سال جیل کاٹنے کے بعد
انگریزی جیل سے فرار ہوگیا۔ اور اپنے علاقے کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہوکر
ڈاکو بن گیا۔

شاید فجاؔ ابھی تک زندہ ہوتا۔ اگر اُسے خانم سے محبت نہ ہو گئی ہوتی
خانم سردار موسیٰ خاں کی لڑکی تھی۔ اور سردار موسیٰ خاں فتح گڑھ کا نمبردار تھا
اور اپنے علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا اور خانم اُس کی اکلوتی لڑکی تھی
اور سُنا ہے کہ اس قدر حسین تھی کہ راولپنڈی اور گوجر خاں کے انگریزی علاقے
تک سے اُس کی شادی کے پیغام آتے تھے۔ فجا اُسی خانم پر مرمٹا تھا۔

فجےؔ نے خانم کو سب سے پہلے سُون کے میلے میں دیکھا تھا۔ سُون کا میلہ
ہر سال برسات کے موسم میں دریائے سُون کے کنارے ہوتا ہے۔ ایک طرف
ریاستی علاقہ دوسری طرف انگریزی علاقہ بیچ میں دریائے سُون بہتا ہے۔
اور یہ میلہ ہر سال اُسی مزار پر ہوتا ہے اور دوہالے اور فتح گڑھ دونوں علاقوں
کے گکھڑ اپنی بندوقوں کو چھوڑ کر اور اپنی رقابتوں کو بھول کر اور لڑائی جھگڑوں
کو بالائے طاق رکھ کر شاہ نظیر کے میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ سُنا ہے کہ اِس
میلے میں آج تک کبھی کوئی فساد نہیں ہُوا۔ کبھی کوئی پولیس کا آدمی نہیں آیا۔ یہ
گکھڑوں کا قومی میلہ ہے۔ اور اس دن کے لیے دُور دُور سے علاقے کے گکھڑ

اس مقام پر پہنچتے ہیں اور اونچ نیچ نابرابری اور ذاتی منافقات کے تمام مسائل بھول کر اپنی قومی یک جہتی کی یاد تازہ کرتے ہیں

اس موقعے پر کشتیاں ہوتی ہیں۔ پیچے لڑائے جاتے ہیں۔ بنسیاں پکڑی جاتی ہیں اور سب سے آخر میں تیراکی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ کیونکہ سون کا دریا بھی تو اپنے علاقے کے لوگوں کی طرح شوریدہ سر ہے۔ اور اسی مقام پر تو وہ اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔ دونوں طرف اونچی اونچی ننگی چٹانوں والی گھاٹیاں کھڑی ہیں۔ جن کو کاٹتا ہوا ایک خطرناک تیزی سے دریائے سون پل کے نیچے سے گزرتا ہے۔ جس کی دیواریں تو ایک طرف فتح گڑھ والے قلعے سے مل جاتی ہیں اور دوسری طرف انگریزی علاقے کی کسٹم کی چوکی پر ختم ہوتی ہیں۔ یہاں پر دریائے سون کی روانی سب سے تیز ہے۔ اور پھر برسات میں جب یہ میلہ ہوتا ہے اُس زمانے میں تو سون کے تنگ پاٹ کی روانی اور اُس کی کف آلود لہروں کے غیض و غضب کا عالم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی ہزاروں من وزنی چٹان بھی اس پانی کے بہاؤ کے سامنے آئے گی تو گھاس کے تنکے کی طرح بہا لے جائے گی۔ ان طوفانی پانیوں میں تیرنا چیلنج بھی موت کو دعوت دینا ہے۔ مگر گکھڑ نوجوان ہر سال خوشی خوشی اس تیراکی کے مقابلے میں شریک ہوتے ہیں۔ کئی بار کئی تیراک شوریدہ سر لہروں کی تاب نہ لاکر اُن کے تھپیڑوں سے پار نہ جا سکے اور واپس بھی نہ آ سکے۔ بلکہ پانی کی لہروں میں یوں بہہ گئے کہ دوسرے دن دس میل کے فاصلے پر نیچے کی گھاٹی کے کنارے اُن کی لاش ملی۔ تو بھی نوجوانوں میں تیراکی کا یہ مقابلہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ کیونکہ اس مقابلے

میں اوّل نمبر پر آنے والے کو گکھڑ قوم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ ہر سال سات نوجوانوں کی ایک ٹولی فتح گڑھ کے قلعے کی دیوار کے پیچھے اُس پار جانے کے لیے کھڑی رہتی ہے اور سات نوجوانوں کی ٹولی دو ہائے کے کنارے سے اِدھر آنے کے لیے کھڑی رہتی ہے۔ ایک اشارے پر دونوں طرف کے نوجوان پانی میں کود پڑتے ہیں اور جو نوجوان سب سے پہلے اُدھر سے اِدھر یا اِدھر سے اُدھر کے کنارے پر پہنچتا ہے اُسے چاندی کے موٹھ والا خنجر انعام میں دیا جاتا ہے۔ اور یہ رسم بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تیر کر آنے والا نوجوان کنارے پر کھڑے ہوئے سرپنچ یا مقدم کے پاس جاکر اُسے تعظیم دیتا ہے۔ مقدم اُسے گلے سے لگا لیتا ہے اور اُس کا ماتھا چوم کر اُسے قومی خنجر پیش کرتا ہے جسے لے کر نوجوان دو قدم پیچھے ہٹتا ہے اور پھر خنجر کو اُٹھا کر مقدم کو فوجی سلام کرتا ہے۔ پھر مقدم کہتا ہے۔

"بول نوجوان اور کیا چاہیئے؟"

اِس سوال کے جواب میں نوجوان کہتا ہے۔" شاہ نظر کا سایہ اور مقدم کی دعا چاہیئے۔"

اتنا کہہ کر نوجوان سر جھکا لیتا ہے اپھر مقدم آگے بڑھتا ہے اور وہ نوجوان کے کندھے پر ایک چادر ڈال دیتا ہے جسے نوجوان اپنے دونوں ہاتھوں پر پھیلا دیتا ہے اس پر وہ مقدم اُس پھیلی ہوئی چادر میں نقد انعام ڈال دیتا ہے جو ہمیشہ ایک سو گیارہ روپے کا ہوتا ہے۔

ہمیشہ ہر سال یونہی ہوتا ہے۔ اِسی طرح کے سوال جواب ہوتے ہیں جیتنے

والا مقدم کو تعظیم دیتا ہے۔ مقدم آگے بڑھ کر اُسے گلے سے لگاتا ہے۔ اُسے قومی خنجر دیتا ہے۔ نوجوان فوجی سلام کرتا ہے۔ مقدم پوچھتا ہے بول جوان اور کیا چاہیئے، جوان کہتا ہے۔ شاہ نظیر کا سایہ اور مقدم کی دعا چاہیئے۔ اس پر مقدم نوجوان کے گلے پہ چادر ڈالتا ہے۔ نوجوان چادر کو اپنے دونوں ہاتھوں پر پھیلا کر خاموشی سے سر جھکاتا ہے تو مقدم اُس کی پھیلی ہوئی چادر میں ایک سو گیارہ روپے ڈال دیتا ہے۔ اور ڈھول تاشے بجنے لگتے ہیں اور گکھڑ نوجوان شور مچاتے ہوتے آتے ہیں اور اپنے ہیرو کو کندھے پر اُٹھا کر ناچنے لگتے ہیں۔ صدیوں سے یونہی ہو رہا ہے۔

مگر جس سال فجے نے تیراکی کے مقابلے میں حصّہ لیا۔ اُس سال میلے سے سات دن پہلے خلافِ معمول دِن رات بارش ہوتی رہی تھی۔ اور بڑی بوڑھیوں کو بھی یاد نہ تھا کہ اس علاقے میں ایسی زور کی جھڑی اس سے پہلے کبھی ہوئی تھی۔ دریائے سُون کا پانی پُل سے صرف چند گز نیچے رہ گیا تھا۔ اور چٹانوں سے اُوپر قلعے کی دیواروں سے ٹکراتا تھا اور دوسری طرف شاہ نظیر کے مزار کے چبوترے تک پہنچ گیا تھا۔

اُس سال فجا انگریزی جیل سے بھاگ کر اپنے علاقے میں پناہ گزین ہوا تھا۔ اب تک وہ دو چار چوکیوں پر حملہ کر چکا تھا۔ اور گکھڑ نوجوانوں میں اُس کی شہرت پھیلنا شروع ہوئی تھی۔

اُسی سال میلے میں فجے نے خانم کو دیکھا جو سردار موسےٰ خاں کی اکلوتی لڑکی تھی اور اپنے علاقے کی حسین ترین دوشیزہ سمجھی جاتی تھی۔ لمبے قد والی سیاہ

آنکھوں والی دراز بالوں والی بھرپور جوانی والی خانم میلے میں جس طرف سے گزرتی تھی۔ تو جوانوں کے دل دھک سے رہ جاتے تھے اور وہ سنّاٹے میں آ کر رہ جاتے تھے۔ ایسا باوقار مرعوب کر دینے والا حُسن اُنھوں نے آج تک اپنے علاقے کی کسی عورت میں نہ دیکھا تھا۔ خانم کو اس میلے میں جس نے دیکھا سینے پر ہاتھ رکھ کر رہ گیا۔ فجّا حالانکہ خود ایک خوب صورت کڑیل جوان تھا۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہُوا۔ رنگ سانولا۔ سینہ فراخ اور جسم اس قدر مضبوط جیسے اُس کے وطن کی سانولی پہاڑیوں کی ننگی چٹان سے تراشا گیا ہو۔ مگر جونہی اُس نے خانم کو دیکھا تو اُس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ اُس کا سانس اُس کے سینے میں اٹکنے لگا۔ خانم نے ایک سیدھی سپاٹ کُھلی بے خوف نڈر نگاہ اُس پر ڈالی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اور یکایک فجّے کو ایسا محسوس ہُوا جیسے سُورج پر سایہ سا آ گیا ہے۔

اُسی وقت اُس نے اپنے دل میں محسوس کیا کہ اُسے تیراکی کے مقابلے میں حصّہ لینا چاہیئے۔ حالانکہ اِس میلے میں پولیس کے مخبر بہت ہوں گے۔ اور اُس کے حمایتیوں نے اُسے اُس مقابلے میں حصّہ لینے سے منع کیا تھا۔ اور اپنے تحفّظ کی خاطر اُن کی بات مان بھی گیا تھا۔ مگر خانم کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اُس کے دل میں تیراکی کے مقابلے میں حصّہ لینے کی خواہش زور پکڑنے لگی اور جونہی تیراکی کے مقابلے کے لیے ڈھول بجنے لگے۔ وہ لنگوٹ باندھ کر میدان میں آ گیا۔ اور اُس نے اپنے دوست شاہ نواز خاں کو ہٹا کر اُس کی جگہ تیراکی کے مقابلے میں لے لی۔ شاہ نواز نے حیرت کی نگاہ سے فجّے کو دیکھا۔ مگر فجّا اُس کا

سردار اور راہنما تھا۔ اس لیے شاہ نواز مقابلے سے ہٹ گیا۔ اور اُس نے اپنی جگہ بجے کو دے دی۔

لیکن پانی کی روانی اس قدر تیز تھی اور سُون کا دھارا اس قدر خطرناک تھا کہ فتح گڑھ کے کنارے سے ادھر آنے والے تیراکوں میں ایک بھی اِدھر تک نہ پہنچ سکا۔ اور اُدھر سے فتح گڑھ جانے والے تیراکوں میں سے صرف دو جوان ریاستی علاقے کے کنارے تک پہنچ سکے۔ جہاں سردار موسےٰ خاں مقدم کی حیثیت سے اُن کی عزت افزائی کے لیے موجود تھا۔ اُس کے پیچھے اُس کی بیٹی خانم کھڑی تھی۔ اور اُس کے گاؤں کے لوگ اور اب پُل پار کر کے دوہالے کے علاقے کے لوگ بھی ڈھول بجاتے ہوئے اِس رسم کو دیکھنے کے لیے آ گئے تھے۔

بجا سب سے پہلے نمبر پر آیا تھا۔ اُس کے ٹخنوں سے خون بہہ رہا تھا اور اُس کا سینہ ایک دھونکنی کی طرح پھیل رہا تھا مگر وہ اپنے لنگوٹ کو کستا ہُوا ہنستا ہُوا اپنے بھیگے ہاتھوں سے اپنے بھیگے چہرے کو پُونچھتا ہُوا سردار موسےٰ خاں کے سامنے بھاگ کر چلا گیا۔ قریب جا کر اُس نے تعظیم دی۔

موسےٰ خاں نے اُسے اپنے گلے سے لگایا۔ اُس کے بھیگے ہوئے ماتھے کو چُوما جس پر بھیگے ہوئے بالوں کی لٹیں پڑی تھیں۔ پھر اُس نے اپنی کمر سے قومی خنجر نکال کر بجے کے ہاتھ میں دیا۔ بجے نے دو قدم پیچھے خنجر کو ہاتھ میں اُٹھا کر اپنی دونوں ایڑیاں ملا کر مقدم کو فوجی سلام کیا۔

سردار موسےٰ خاں نے پوچھا۔

"بول جوان کیا چاہیئے؟"

"شاہ نظیر کا سایہ اور خانم کا ہاتھ!" فجے کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ اُس کی سیدھی صاف نگاہ خانم پر تھی۔

خانم نے چونک کر دراز قد فجے کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر اُس کی نگاہ شرم سے جُھک گئی اور اُس کی زیتونی رنگت گلاب کی طرح سُرخ ہو گئی۔

ایک دم سینکڑوں لوگوں کے چہرے فق ہو گئے۔ یہ کون دیدہ دلیر تھا جس نے بزرگوں کی پُرانی رسم کو توڑا تھا۔ یوں اور یوں ایک لمحے میں فتح گڑھ کے سب سے بڑے سردار کی بھرے میلے میں بے عزتی کر ڈالی تھی اور یوں سب کے سامنے اُس کی بیٹی مانگ لی تھی۔

"تجھے تیری یہ ہمت؟" سردار موسےٰ خاں غصے سے گرجا۔ ایک معمولی ڈاکو ہو کر ایک سردار کی لڑکی پر نظر رکھتا ہے۔ بدتخم۔ بے ایمان۔ تُو نے بھرے میلے میں بزرگوں کی رسم کو توڑا ہے۔ آج تیری بوٹی بوٹی نوچ لی جائیگی۔

موسےٰ خاں اور اُس کے گاؤں کے بہت سے لوگ فجے کو مارنے کے لیے آگے بڑھے۔ مگر فجا پلٹ کر واپس دریا کی طرف بھاگنے لگا۔ اور بیشتر اس کے کہ وہ لوگ اُسے پکڑ سکتے اُس نے ایک اونچی چٹان سے کُود کر پھر دریا میں چھلانگ لگا دی۔

تماشائیوں نے اپنے دل تھام لیے۔ اس بار فجا چڑھتے ہوئے دریا کو چیر کر شاہ نظیر کے مزار کے چبوترے پر نہیں اُتر سکا۔ بلکہ اُس سے بہت نیچے میلے کے مقام سے بہت دُور نیچے کنارے پر جا لگا۔ پھر ایک چٹان پر کھڑے

ہو کر اُس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پھیلا کر اپنے منہ کے دونوں طرف رکھ کر زور سے چلّا کر کہا۔

"موسےٰ خاں یاد رکھو تیری بیٹی اب میری ہے"

(۴)

اب وہ مُردہ تھا۔ اور اُس کی لاش پولیس والوں کی معیت میں ہسپتال میں آچکی تھی۔ ہسپتال میں سینکڑوں لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے آدمی ہسپتال میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہسپتال کے اردگرد میلہ سا لگ گیا تھا۔ جوق در جوق لوگ اُس باغی کو دیکھنے کے لیے آرہے تھے۔ جس کے سر کے لیے راجہ جی نے دس ہزار روپے کا انعام رکھا تھا۔ انگریزی علاقے میں بھی تاریں بھیجی جا چکی تھیں اور سُنا تھا کہ دو روز میں دربار کا انگریز ڈپٹی کمشنر خود لاش کی شناخت کے لیے آنے والا ہے۔ تب تک یہ لاش ہسپتال کے مُردہ خانے میں برف میں دبا کر رکھی جائے گی۔ یہ مُردہ خانہ سپیشل کوارٹروں کے نیچے کی گھاٹی پر سب سے الگ تھلگ تھا۔ اور مجھے اِس جگہ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اور میں اس طرف کبھی نہ جاتا تھا۔ اور نہ ہی میری ماں جی مجھے کبھی اس طرف جانے دیتی تھیں۔ اور مُردہ خانے کے بھوتوں اور چڑیلوں کے قصے سُنا کر اُنھوں نے مجھے مُردہ خانے سے اور بھی خائف کر دیا تھا۔ اور میں اپنے پتا جی کی جرأت پر بہت حیران ہُوا کرتا تھا کہ کس طرح وہ مُردوں کی چیر پھاڑ اس دلجمعی سے کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ زمانہ میرے بچپن کا تھا۔ لیکن اب بڑا ہو

جانے پر مجھے مُردوں پر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ مُردے خوش قسمت تھے کہ وہ مر گئے۔ لیکن حیرت اُن زندوں پر ضرور ہوتی ہے۔ جو شب و روز واقعات و حالات کا ظلم سہتے ہیں۔ خود اپنی آنکھوں سے اپنی زندگی کے ٹکڑے ہوتے دیکھتے ہیں اور کوئی احتجاج کئے بغیر سماج کے مُردہ خانے میں پڑے پڑے سڑ جاتے ہیں!

لاش کو دیکھنے کی ہمت تو مجھ میں نہیں ہوئی۔ اس لیے میں ہسپتال کے برآمدے کے باہر ہی ڈرا سہما لوگوں کی باتیں سُنتا رہا جو اندر سے لاش دیکھ کر آرہے تھے۔ اور اب ہسپتال کے باہر باغ کی کیاریوں میں دو چار دس کی ٹولیاں بنائے باتیں کر رہے تھے۔ ایک بچے کی موجودگی کو کون اہمیت دیتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ باتیں کرتے رہے اور میں اِس ٹولی سے اُس ٹولی میں جاکر اُن کی باتیں سُنتا رہا۔ اور جو باتیں وہ کر رہے تھے اُن سے معلوم ہُوا کہ موسےٰ خاں نے بڑی جیداری سے فجے کا پیچھا کیا تھا۔ اور جب فجا جان بچا کر بھاگنے لگا تو موسیٰ خاں نے اُسے گولی سے ہلاک کر دیا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ موسےٰ خاں فجے کو زندہ ہی پکڑ کر راجہ صاحب کے حضور میں پیش کرتا۔ مگر راجہ صاحب اب بھی موسےٰ خاں کے کارنامے پر بہت خوش تھے۔ تجویز یہ تھی کہ جب انگریز صاحب بہادر وہاں سے آکر لاش کو شناخت کرے گا اور موسےٰ خاں کے انعام کے کاغذ پر دستخط کر دے گا تو فجے کا سر کاٹ کر ایک نیزے پر چڑھا کر صدر مقام میں جگہ جگہ دکھایا جائے گا تاکہ بدمعاشوں اور باغیوں کو عبرت ہو۔

ہسپتال میں اس واقعے پر خود موسےٰ خاں بھی اپنے تیس چالیس حمایتیوں کے

ساتھ موجود تھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والا ناٹے قد کا تانبے کے رنگ کا دُہرے بدن کا اُدھیڑ عمر کا آدمی تھا مجھے اُس کی آنکھیں بڑی خوفناک معلوم ہوتی تھیں اور اُس کی ہنسی بڑی کرخت اور کڑوی تھی اور وہ گفتگو کرتے ہوئے اپنی کارتوسوں کی پیٹی کو ہلاتا تھا جو اُس کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ مجھے موسےٰ خاں سے بڑا ڈر لگا۔ اِس لیے میں اُسے دُور ہی سے دیکھ کر واپس نیچے اپنے گھر کو بھاگ گیا۔ جہاں ماں جی نے مجھے اوپر ہسپتال جانے پر ڈانٹ پلائی اور دن بھر کے لیے گھر سے نکلنے کے لیے منع کر دیا۔

جب شام گہری ہو گئی تو پتا جی ہسپتال سے تھکے ہارے لوٹے۔ مگر آج ماں جی نے اُنھیں بنگلے کے باہر برآمدے میں ہی روک لیا۔ یہ ماں جی کا دستور تھا۔ کہ جس دن ہسپتال میں کوئی لاش آتی تھی۔ وہ پتا جی کو گھر میں گھسنے نہیں دیتی تھیں۔ جب تک وہ اُن پر گنگا جل نہ چھڑک دیں۔ جو پوجا کے کمرے میں ایک بند ٹین میں مقفل رہتا تھا۔ اس لیے ماں جی نے برآمدے کے باہر ہی پتا جی کو روک دیا۔ اُن پر دُور ہی سے گنگا جل چھڑکا پھر اُن سے کہا کہ وہ اپنے کپڑے اُتار دیں اور ایک نئی اور کوری دھوتی انھوں نے پتا جی کو پہننے کو دی۔ اور وہ اُسی دھوتی میں لپٹے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ماں جی اُنھیں سیدھے غسل خانے میں لے گئیں۔ جہاں گرم پانی اُن کے نہانے کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا نہا دھو کر نئے کپڑے پہن کر جب ڈاکٹر صاحب غسل خانے سے نکلے تو ماں جی کی جان میں جان آئی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ہم تینوں نے کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد پتا جی سیدھے سونے کے کمرے میں چلے گئے

اور دیر تک ایک بڑی کتاب اٹھا کر اُلٹ پلٹ کر کچھ دیکھتے رہے۔ اور دو تین گھنٹوں کے بعد جب رات گہری ہو چکی اور اُنھیں پورا یقین ہو گیا کہ میں سو گیا ہوں تو وہ ماں جی کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔

"کاکے دی ماں، سو گئی کہ جاگتی ہے؟"

"نہیں جاگتی ہوں ــــــ ماں جی اپنے بستر میں دبکی سہم کر بولیں۔

"تو بولتی کیوں نہیں؟"

"کیا بولوں۔ مجھے تو اُس موئے ڈاکو سے ڈر لگتا ہے جو مُردہ خانے میں پڑا ہے۔"

وہ ڈاکو نہیں تھا۔

ڈاکو نہیں تھا تو پھر کون تھا۔؟ ماں جی نے حیرت سے پوچھا۔

پتا جی آہستہ سے بولے۔ وہ تیری میری طرح کا ایک انسان تھا جو اپنے لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کرتا تھا۔"

"پرے ہٹو" ماں جی تنک کر بولیں۔

تم بھی جلتے کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کرتی ہو۔ ساری دنیا جانتی ہے۔ فجّا ایک ظالم ڈاکو تھا۔ جس کے سر پر راجہ جی نے انعام رکھا تھا کیونکہ اُس نے سارے علاقے میں اُودھم مچا رکھا تھا۔ وہ تو پرماتما بھلا کرے عیسےٰ خاں کا جس نے اُس ظالم کو گولی سے مار دیا۔"

"عیسےٰ خاں نہیں موسےٰ خاں!" پتا جی نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔ ان سب موئے مسلمانوں کے نام ایک جیسے ہوتے

ہیں۔ مجھے نہیں آتا۔ . . . . ." ماں جی نے ہاتھ چلا کر بڑی نخوت سے کہا۔
"اور ہندوؤں کے نام ایک سے نہیں ہوتے کیا؟ پتاجی مسکرا کر بولے۔
اندر، بیرندر، مہندر، راجندر، گجندر، سبھی اندر ہی اندر ہیں!
"تم تو جب بات کرنے بیٹھتے ہو۔ مسلمانوں کی طرفداری کرنے لگتے ہو۔ اب نجا ڈاکو، ڈاکو ہی نہیں ہے۔ کل کہو گے کہ عیسےٰ خاں نے نجے کو مارا ہی نہیں۔"
"عیسےٰ خاں نہیں موسےٰ خاں۔" پتاجی نے پھر بتایا۔
"اچھا بابا موسےٰ خاں ہی سہی۔ پھر؟"
"پھر قصّہ یہ ہے کہ موسےٰ خاں نے نجے کو لڑائی میں نہیں مارا۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔
"وہ بات! میں نہ کہتی تھی کہ تم آجاؤ گے اپنی اُلٹی سیدھی تھیوری پر" ماں جی ذرا غصّے سے بولیں۔
لوگ کہتے ہیں نجے کو موسےٰ خاں کی لڑکی خانم سے محبت تھی۔ اور خانم بھی اس جیالے نوجوان سے پیار کرنے لگی تھی۔ مگر چونکہ موسےٰ خاں نجے کے خلاف تھا۔ اور نجے کے خلاف ریاستی اور انگریزی دونوں علاقوں کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے۔ اس لیے نجا خانم سے چوری چھپے ملتا تھا۔ وہ دن بھر پہاڑیوں کی غاروں اور کھاروں میں چھپا رہتا تھا اور دور دراز کے تھانوں پر ڈاکے مارتا۔ پولیس اور فوج کو عاجز کرتا اور پھر ایک چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتا۔ سارے علاقے کے نوجوان در پردہ اس کے حامی تھے۔ نوجوان لڑکیوں نے اس کی تعریف میں گیت کہے تھے۔ اور وہ اپنے علاقے کا بہت بڑا ہیرو

تھا۔ اور خانم جی جان سے اُس سے پیار کرتی تھی۔ گہری اندھیری راتوں میں سوات دریا کے کنارے فتح گڑھ کے قلعے کی دیواروں کے نیچے خانم اور فجا ملا کرتے تھے۔ چند گھنٹوں کے لیے۔ پھر نئی فجر سے پہلے فجا یا تو فتح گڑھ کی سنگلاخی پہاڑیوں کی راہ لیتا یا دریا پار کر کے دوہابے کے علاقے میں چلا جاتا۔ اور اُسے آج تک کوئی نہ پکڑ سکا تھا۔

پھر وہ کیسے پکڑا گیا؟ ماں جی نے پوچھا۔

خانم کی ایک خالہ نے جواب تک اُس کی ہمراز رہی تھی۔ ایک روز موسےٰ خاں کو اُس نے سب کچھ بتا دیا۔

"ہائے ری جہنم جلی مٹھا سڑی بڈھی خالہ تجھ کو شرم نہ آئی"۔ ماں جی کو ایک دم خانم اور فجے پر ترس آ گیا۔ نی خصماں کھانیئے۔ ماں جی نے گویا اُس خالہ کو اُسی لمحے مخاطب ہو کر کہا۔ تجھے اُن غریبوں کا پیار برباد کرتے ہوئے لجا نہ آئی۔

پھر وہ پتا جی کی طرف مڑ کر بولیں "پھر کیا ہُوا؟"

پھر یہ ہُوا۔ کہ یہ خبر ملتے ہی موسےٰ خاں نے فجے کو پکڑنے کے لیے گاؤں کے چاروں طرف اپنا جال پھیلا دیا لیکن اُس نے قلعے کے فوجیوں کو مطلق خبر نہ دی۔ مبادا وہ بھی انعام کے حقدار بن جائیں۔ ہر روز رات کو اُس کے لوگ پہرہ دیتے تھے۔ اور صرف اِس ٹوہ میں رہتے تھے کہ رات کو کہیں خانم باہر جائے تو وہ اُس کا پیچھا کریں۔

پھر؟ ماں جی کی سانس تیز ہو گئی۔ پہلے۔ تین روز تو کچھ نہ ہُوا۔ خانم بڑے مزے سے اپنے گھر میں سوتی رہی۔ چوتھی رات کو جب آدھی اِدھر ہوئی آدھی

رات اُدھر ہوئی تو خانم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور خالہ کو بھی اُس نے جگا دیا پھر خانم نے بال سنوارے نئے کپڑے پہنے۔ نیلی سُوسی کی مغلئی شلوار اور قمیض اور سر پر ریشمی اوڑھنی ڈال کر اپنے محبوب سے ملنے چلی!

ہا! ماں جی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"خالہ ساتھ میں تھی" پتا جی نے بتایا۔

"کٹنی۔ مُردار۔ کیڑے پڑیں اُس کی جون میں" ماں جی نے غصّے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

قلعے کی دیواروں کے نیچے وہ دونوں ملے۔ خانم اور فجا۔ دونوں مل کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر جب رات کا تیسرا پہر جانے لگا۔ تو فجا بادل نخواستہ خانم سے الگ ہُوا۔ اور گاؤں کی چوحدّی سے باہر اُس راستے پر چلنے لگا۔ جو فتح گڑھ کے پہاڑی درّے کو جاتا ہے جہاں اُس نے اپنا خفیہ اڈہ بنا رکھا تھا۔ اِدھر نیچے کے راستے سے فجا جا رہا تھا۔ اُدھر اُوپر کے راستے سے خانم خالہ کو لے کر اپنے گاؤں کو جا رہی تھی دونوں راستوں پر تاریک سے سائے سے ملتے تھے۔ اور فجا کبھی خانم کے سائے کو دیکھ کر خوش ہو لیتا۔ کبھی خانم نیچے جاتے ہوئے فجے کو دیکھ کر دل ہی دل میں واری نیاری ہونے لگتی۔

"پھر؟"

پھر جب فجا دریا کے کنارے ایک تنگ موڑ سے گزر کر درّے کی جانب مڑنے لگا تو کسی نے پیچھے سے چٹانوں کے عقب سے اُس پر گولیوں کی بارش کر دی۔ ایک ساتھ تڑ تڑ تڑ کی آواز سے چھ گولیاں اُس کی پیٹھ میں پیوست ہو گئیں۔

فجا زور سے چلایا "خانم" اور اوپر کے راستے پر جاتی ہوئی خانم گولیوں کی آواز سن کر کانپ گئی اور دوڑتی گرتی پڑتی گھاٹیوں سے نیچے اترتی اُس موڑ پر پہنچ گئی جہاں خاک و خون میں لت پت اُس کا محبوب پڑا تھا۔ بے جان مُردہ اور اُس کی لاش پر اُس کا باپ موسے خاں اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے مسکرا رہا تھا۔

ماں جی کچھ دیر ساکت رہیں۔ خاموشی سے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھتی رہیں۔ پھر بولیں "تم تو ایسے بات کرتے ہو جیسے تم اُس موقع پر موجود تھے"

"میں تو نہیں تھا" ڈاکٹر صاحب بولے۔ "مگر جو تھا اُس نے مجھے خود یہ واقعہ سنایا ہے"

"کس نے؟"

"خانم نے!"

خانم یہاں آئی ہے۔ ماں جی نے حیرت سے پوچھا۔ یہاں؟ صدر مقام پر؟"

ہاں! وہ اِس وقت باہر برآمدے میں بیٹھی ہے۔ پتا جی نے سرگوشی میں کہا۔

ماں جی ایک دم چونک گئیں۔ دیر تک چپ رہیں۔ پھر آہستہ سے بولیں۔

"وہ یہاں کیوں آئی ہے۔ تمھارے بنگلے پر؟ وہ کیا چاہتی ہے؟"

وہ چاہتی ہے کہ ایک دفعہ مجھے کو دیکھ لے!

ماں جی پھر دیر تک چپ رہیں۔ پھر بولیں۔ اُس کے باپ کو معلوم ہے کہ وہ یہاں آئی ہے؟

"نہیں۔ وہ سب سے چھُپ کر یہاں آئی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ میں ایک دفعہ اُسے بچے کی لاش دکھادوں۔"

"مگر بچے کی لاش تو مُردہ خانے میں ہے!"

"ہاں۔ مگر مُردہ خانے کی کنجی تو میرے پاس ہے۔"

ماں جی خوف سے لرز کر بولیں۔ "اِس وقت آدھی رات میں تم مُردہ خانے کے اندر جاؤ گے؟"

"کیا حرج ہے؟"

"اور اگر کسی کو پتہ چل گیا۔ اگر کسی نے رپورٹ کر دی۔ اگر کوئی شکایت راجہ جی تک پہنچ گئی؟"

"اس اندھیرے میں کون دیکھتا ہے؟"

"نہیں۔ نہیں۔ میں تمھیں نہیں جانے دونگی۔" ماں جی ایک دم فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔ "تم تو باؤلے ہو اور عقل نام کی کوئی چیز تمھارے دماغ میں نہیں ہے! میں خود ابھی باہر جاتی ہوں اور اُس خانم سے بات کرتی ہوں۔" ماں جی بستر سے اُٹھتے ہوئے بولیں۔

"ایسا مت کرو۔ ایسا مت کرو۔" پتا جی ایک دم گھبرا کر بولے۔ "اُس کا دل مت توڑو۔ ذراسی تو بات ہے!"

"واہ! چاہے ہماری نوکری چلی جائے۔ خوب۔ یہ بھی کیا تماشا ہے۔ مرنے والا تو مر گیا۔ ساتھ میں ہمارا رزق بھی لیے جائے گا۔"

ماں جی ایک دم کمرے سے باہر نکل گئیں۔ پتا جی اُس کے پیچھے بھاگے۔

اور اُن دونوں کے پیچھے دبے پاؤں میں بھی باہر نکلا۔ مگر برآمدے میں نہیں گیا۔ دروازے کی آڑ سے لے کر دیکھنے لگا۔ برآمدے کے ایک چوبی ستون سے ٹیک لگائے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ دو ستونوں کے درمیان لٹکی ہوئی لالٹین کی روشنی اُس کے مضمحل اور اُداس چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ماں جی کو دیکھ کر جب وہ لڑکی اُٹھی تو مجھے وہ ماں جی سے بھی لمبی معلوم ہوئی۔ اُس کے سیاہ بال کھلے ہوئے تھے۔ اور گھٹنوں تک آتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے لمبے بال کسی عورت کے نہیں دیکھے۔ اُس کا چہرہ سپید تھا اور آنکھیں گہری سیاہ تھیں۔ اور وہ بالکل چُپ تھی۔ ماں جی کو دیکھ کر بھی وہ بالکل چُپ کھڑی رہی۔

چلی جاؤ! ماں جی نے گرج کر کہا۔

"نہیں نہیں! کاکے دی ماں! پتا جی نے پریشان ہو کر کہا۔ مگر ماں جی فوراً تڑپ کر بولیں۔ تم چُپ رہو۔ پھر خانم کی طرف مڑ کر ایک انگلی اُٹھا کر بولیں۔" سیدھے سیدھے یہاں سے چلی جاؤ۔ ورنہ ابھی پولیس کو بُلاتی ہوں؟

"بس ایک بار مجھے اُسے دیکھ لینے دو" خانم آہستہ سے بولی۔

"اب اُسے دیکھ کر کیا کروگی؟" ماں جی نے پوچھا۔

'میں اُس سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں! خانم نے بڑی سادگی سے کہا۔

پگلی ہوئی ہو! مُردے سے کون باتیں کر سکتا ہے؟

میں کروں گی! خانم نے کامل یقین سے کہا" مجھے اُسے ایک بار دکھا دو صرف ایک بار"

ماں جی روتے ہوئے بھرائی آواز میں بولیں۔ جا ابھاگن چلی جا۔ مُردے اگر کسی کی بات سُن سکتے تو آج کوئی عورت بیوہ نہ ہوتی۔ کسی کا بچہ یتیم نہ ہوتا۔ مگر مُردے سُن نہیں سکتے!"

خانم دیر تک میری ماں کو دیکھتی رہی اُس کی نگاہ کبھی میری ماں پر جاتی کبھی ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر۔ آخر وہ آزردہ خاطر ہوکر بولی۔ ٹھیک ہے مُردے نہیں سُن سکتے۔ شاید اس لیے تم بھی نہیں سُن سکتی ہو۔ ڈاکٹر بھی نہیں سُنتا ہے۔ اِس جگہ پر کوئی بھی کسی کی نہیں سُنتا ہے۔ کیا یہاں سب مُردے بستے ہیں؟

خانم نے بڑی حقارت سے پوچھا اور اُس کی گہری سیاہ آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے۔ پھر وہ مُنہ موڑ کر مزید بات چیت کئے بغیر برآمدے سے باہر نکل گئی۔

(۳)

دوسرے دن خانم نے مجسٹریٹ لال خاں کی عدالت میں درخواست دی کہ وہ نجے کی بیوہ ہے۔ اس لیے نجے کی لاش اُس کے حوالے کی جائے۔ درخواست یہ کہ جب وہ خود عدالت میں پیش ہوئی تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ اور عدالت کو اپنا کمرہ تماشائیوں سے خالی کرانا پڑا۔ پھر بھی علاقے کے تمام بڑے بڑے افسر اور چودھری اور معزز لوگ عدالت میں موجود تھے۔ سردار موسےٰ خاں بھی موجود تھا۔ مجسٹریٹ لال خاں نے درخواست سے کہہ پوچھا۔

" فیض محمد تیرا کیا لگتا ہے ؟"

" وہ میرے سر کا سائیں (سرتاج) تھا " خانم نے بڑی بے خوفی سے جواب دیا۔

"کیا تیری اُس کی شادی ہوئی تھی " مجسٹریٹ نے پھر پوچھا۔

" نہیں !" خانم بولی ۔

پھر کیا تیری اُس کی آشنائی تھی ؟"

" نہیں !" خانم غصّے سے بھڑک کر بولی " میں تو کنواری ہوں ۔ اُس نے تو آج تک میرے جسم کو چھُوا تک نہیں ! مگر پھر بھی وہ میرے سر کا سائیں تھا اُس کی لاش میرے حوالے کر دی جائے !

موسے خاں نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ کر کہا " سرکار ۔ یہ میری لڑکی ہے میری اجازت کے بغیر گھر سے بھاگ کر یہاں آئی ہے ۔ اُسے میرے حوالے کر دیا جائے "

" میں کسی غدّار کی لڑکی نہیں ہوں " خانم نے گرج کر کہا " میں فجے کی بیوہ ہوں اُس کی لاش میرے حوالے کر دی جائے !

مجسٹریٹ لال خاں نے خانم کو سمجھاتے ہوئے کہا " خانم تُو ایک معزز سردار اور نمبردار کی لڑکی ہے ۔ تیرے باپ نے ریاست کے ایک خطرناک باغی کو جس کے سر پر دس ہزار کا انعام تھا ، مار کر ہم سب کی خوشنودی حاصل کی ہے ۔ تیرے باپ کو انگریزی سرکار سے پانچ ہزار کا انعام ملے گا ۔ راجہ صاحب سے دس ہزار کا انعام خلعت اور جاگیر ملے گی ۔ ایسے بڑے آدمی کی بیٹی کو ایسی باتیں

نہ کہنی چاہئیں!

خانم نے آہستہ سے مگر گہرے یقین سے کہا۔ آج بھری عدالت میں سب سے کہتی ہوں۔ میرا باپ بھی میرے سامنے کھڑا ہے۔ وہ بھی سُن لے۔ جس انعام کی خاطر میرے باپ نے یہ کام کیا ہے وہ انعام اُس کو کبھی نہیں ملے گا۔ کیونکہ غدار کو انعام نہیں دیا جاتا۔ اُسے تو سزا دی جاتی ہے۔ بس! عدالت میری درخواست کا فیصلہ کرے!

نامنظور! مجسٹریٹ لال خاں نے بآوازِ بلند کہا۔

(۴)

عدالت سے نکل کر خانم اس طرح بھاگی کہ اُس کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ موسیٰ خاں نے اپنی لڑکی کی تلاش میں چاروں طرف آدمی دوڑائے! پولیس نے بھی بڑی دوڑ دھوپ کی۔ مگر خانم ڈھکی کے نیچے پہنچ کر ایسی غائب ہوئی کہ پھر اُس کا پتہ نہ چل سکا۔ خانم کے دھمکی دینے اور دھمکی دے کر اس طرح غائب ہو جانے پر لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کوئی کہتا موسیٰ خاں کی زندگی خطرے میں ہے۔ اُس کی لڑکی اُسے قتل کر دے گی۔ موسیٰ خاں حالانکہ ہر وقت ریوالور اپنی کمر میں رکھتا تھا۔ پھر بھی اُس کی حفاظت کے لیے دو پولیس کے سپاہی ہر وقت اُس کے ساتھ لگا دیئے گئے۔ راجہ صاحب نے موسیٰ خاں کو بُلا کر اُس کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور اُس سے وعدہ کر لیا کہ انگریز ڈپٹی کمشنر دورے سے آکر اپنی شناخت مکمل کر کے موسیٰ خاں کے انعام کے لیے حکم جاری کرے گا۔

راجہ صاحب اُس کے دوسرے دن ہی ایک دربار منعقد کر کے موسے خاں کو اپنے ہاتھ سے دس ہزار کی تھیلی دیں گے۔ خلعت اور جاگیر عطا کریں گے۔

موسے خاں یہ انٹرویو دے کر بے حد خوش خوش اپنی قیام گاہ پر واپس آیا۔

دو دن کے بعد جب انگریز ڈپٹی کمشنر ریاست کے صدر مقام پر پہنچا اور لاش دیکھنے کے لیے ہسپتال میں پہنچا تو ایک عجیب واردات ہوئی۔ موقع پر پہنچ کر سب نے دیکھا کہ مُردے خانے کا قفل ٹوٹا پڑا ہے۔ اور فجے کا سر غائب ہے۔ صرف ایک بے دھڑ لاش ایسی مخدوش حالت میں پڑی ہے کہ کسی طرح بھی پہچانی نہیں جا سکتی۔ جس سر پہ دس ہزار روپے کا انعام تھا وہ سر ہی غائب تھا!

اِس بے دھڑ لاش کو دیکھ کر انگریز ڈپٹی کمشنر نے شناختی کاغذوں پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب انگریز ڈپٹی کمشنر نے انکار کر دیا تو دیسی راجہ کی کیا مجال تھی کہ موسے خاں کو انعام دیتا۔ نتیجے میں موسے خاں کو بے نیل و مرام اپنے علاقے کو لوٹ جانا پڑا۔ جہاں چند روز کے بعد اُس کی لاش قلعے کی دیواروں کے نیچے پائی گئی۔

(۵)

جس دن قفل ٹوٹا اور فجے کا سر غائب ہُوا۔ اُس دن شام کے وقت جب پتاجی گھر لوٹے تو بے حد خوش مسکراتے ہوئے اور گنگناتے ہوئے

"پھیٹی جب کان اِس بن میں"

کا نغمہ اُن کے لبوں پر موجود تھا۔

قفل کس نے توڑا ؟

"پھٹی جیب کان اِس بن میں" پتاجی جواب میں گنگناتے رہے۔

"میں کہتی ہوں ایک دن تم جیل میں جاؤ گے

"پھٹی جیب کان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اور میں بازار میں بیٹھی بھیک مانگوں گی اور تمھارا بچہ ؟"

اِس بن میں ! اس بن میں !! اِس بن میں !!! پتاجی زور زور سے گانے لگے۔

پھر کچھ دیر کے بعد کھانے کے کمرے میں میری ماں سے کہنے لگے۔

"کاکے دی ماں۔ جانتی ہو اس دُنیا میں سب سے قیمتی شے کون سی ہے ؟"

"سونا ؟" میری ماں نے کہا۔

"نہیں۔ آزادی ! ـــــ کاکے دی ماں۔ اِس دنیا میں سب سے مہنگی اور سب سے قیمتی چیز آزادی ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے ہر موڑ پر اس کی پوری قیمت ادا کی ہے !

۹

بچپن کے چہروں میں مجھے شانو کا چہرہ بہت یاد آتا ہے۔ وہ ایک دُبلی پتلی نازک اندام عورت تھی۔ عمر تیس سال کے قریب۔ قد بوٹا سا۔ ہونٹ پتلے پتلے اور گلابی آنکھیں بڑی بڑی لیکن ڈوبتی ہوئی سی، جلد کی رنگت مرمر کی طرح سپید۔ وہ ہمیشہ ماتھے تک ذرا سا گھونگھٹ کاڑھے سفید دھوتی میں ملبوس نظر آتی۔ اُس کی پوری شخصیت ایک ایسی تصویر کی مانند تھی جو دن بہ دن دھندلی ہوتی جارہی ہو۔ اُسے تپدق تھا۔

اُن دنوں تپ دق کا کوئی شافی علاج دریافت نہ ہُوا تھا۔ اکثر مریض مرجاتے تھے۔ بہت کم ایسے خوش قسمت ہوتے تھے جو کسی نہ کسی طرح بچ جاتے تھے۔ اپنی چھوٹی سی محدود دُنیا میں ناکافی ذرائع کے ساتھ میرے والد کو علم

طب میں تجربے کرنے کا بہت شوق تھا وہ اکثر "مشکل" مریضوں کو ہاتھ میں لیتے تھے اور اُن میں سے اگر ایک بھی اُن کی کاوش سے اچھا ہو جاتا تو وہ بے حد خوش ہو جاتے اور کئی دنوں تک اُن کا موڈ بچوں کی طرح تازہ شگفتہ اور شاداب رہتا۔

عورتوں کے لیے ہسپتال میں ایک الگ وارڈ تھا۔ لیکن میرے والد نے شانو کو اُس وارڈ میں رکھا۔ اُس وارڈ سے کوئی سو گز پرے ایک بارک نما بلڈنگ تھی جس پر ٹین کی چھت تھی اور جس میں چھ کمرے ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ اُن میں سے دو کمروں میں اردلی رہتے تھے۔ ایک کمرے میں ہسپتال کے پرانے کموڈ، چلمچیاں اور دیگر کباڑ بھرا ہُوا تھا۔ چوتھا کمرہ سینیئر کمپونڈر صاحب نے اپنے دوستوں کے ساتھ تاش بازی اور گپ بازی کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ پانچویں کمرے میں مالی نے باغبانی کا سامان رکھا ہُوا تھا۔ چھٹے کمرے کو کوئی استعمال کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ اس کمرے کے بارے میں مشہور تھا کہ جو مریض اس میں آکے رہتا ہے۔ مر جاتا ہے۔ میرے والد کو اِس قسم کی باتوں پر اعتقاد نہ تھا لیکن جب پے در پے تین چار اسی قسم کے حادثات یا اتفاقات ہوئے تو اُنھوں نے لوگوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کمرے کو خالی رہنے دیا۔ شانو کو وہ اِس کمرے میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے احتیاطاً سینیئر کمپونڈر کی گپ بازی کا کمرہ جو سب سے بہتر حالت میں تھا اُس سے چھین لیا اور اُس میں شانو کو رکھ دیا۔ سینیئر کمپونڈر نے اِس امر پر اعتراض کیا۔ مگر والد صاحب کا خیال تھا کہ کمپونڈر کو جب ایک چھوٹا سا بنگلہ اُس کی رہائش کے لیے ملا

ہُوا ہے تو اُسے اُسی بنگلے کو اپنی اور اپنے دوستوں کی تفریح کے لیے استعمال کرنا چاہیئے سینیئر کمپونڈر سوتی رام دل ہی دل میں بہت جلا۔ مگر اُس کے آفیسر کا حکم تھا۔ لہٰذا اُسے یہ کمرہ خالی کرنا پڑا۔ وہ تو اُسی دن سے شانو کا دشمن ہو گیا۔

عام طور پر مریضاؤں کے ساتھ اُن کی دیکھ بھال اور نگہبانی کے لیے اُن کے باپ، بھائی بہن، خاوند یا دوسرے رشتے دار آتے ہیں اور علاج کے دوران میں وہیں ہسپتال کے کسی برآمدے میں پڑ رہتے ہیں۔ لیکن شانو کے ساتھ اُس کا جیٹھ آیا تھا اور اُسے ہسپتال میں ڈال کر چلا گیا تھا۔ وہ اپنے موضع کا سب سے امیر آدمی تھا۔ وہ اگر چاہتا تو شانو کے نان نفقے کا بندوبست کر سکتا تھا اور اکثر امیر مریض علاج کے دوران میں ایسا ہی کرتے تھے۔ مگر اُس نے شانو کے سلسلے میں کسی طرح کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا اور چند دن اُس کے پاس رہ کر واپس چلا گیا۔

شانو سورج کے باہر نکلتے ہی اپنی کھاٹ کمرے سے باہر نکال کر دھوپ میں لے آتی اور بستر پر لیٹ کر دھوپ سینکتی، آرام کرتی یا سو جاتی یا کھانا بناتی۔ وہ نہایت کم گو، شریف طبیعت کی عورت تھی اور کسی نے آج تک اُس کے مُنہ سے ایک تلخ بات تک سُنی نہ تھی۔ لیکن مجھے اس بات پر بڑی حیرت تھی کہ وہ چاہے کسی حالت میں ہو ہمیشہ اپنے ماتھے پر گھونگھٹ کاڑھے رہتی۔

لیکن ایک بار میں نے اُسے گھونگھٹ کے بغیر دیکھ لیا۔ صرف ایک لمحے کے لیے اور اُسے دیکھتے ہی میں بھونچکا رہ گیا۔ ہُوا یہ کہ میں اپنے بنگلے سے ہسپتال کی طرف دوڑا دوڑا آرہا تھا پتا جی کو دوپہر کے کھانے پر بُلانے کیلئے

دھوپ خوشگوار تھی۔ لیکن ہوا ذرا تیز چل رہی تھی اور شانو باغ کے ایک کونے میں بیٹھی پھولوں کی کیاریوں میں کھرپی لیے گوڈی کر رہی تھی کہ اتنے میں تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اُس کا چھوٹا سا گھونگھٹ اُلٹ گیا اور میں یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ اُس کے سر پہ ایک بال بھی نہ تھا۔ سارا سر اس طرح منڈا ہُوا تھا جس طرح میرے پتا جی کا چہرہ شیو کے بعد ہوتا ہے۔

جب میں نے پتا جی سے اِس حیرت انگیز امر کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے مجھے بتایا ——— شانو ایک کنواری بیوہ ہے۔ "کنواری بیوہ ہے تو کیا ہُوا؟" میں نے پوچھا۔ ہر عورت کے سر پہ بال ہوتے ہیں۔ مگر یہ تو اپنے بال منڈاتی ہے۔

خود سے نہیں منڈاتی ہے۔ اس کے بال مونڈے گئے ہیں۔ ہمارے علاقے کے براہمنوں میں یہ رسم عام ہے کہ اگر کنواری لڑکی بیوہ ہو جائے تو اُس کے سر کے سارے بال مونڈ دیتے ہیں۔

کنواری لڑکی بیوہ کیسے ہو سکتی ہے؟ میں نے سوچ سوچ کر پوچھا

پتا جی مسکرائے۔ بولے۔ جس دن شانو کا بیاہ ہُوا تھا۔ اُسی دن لگن منڈپ میں ہی اُس کا خاوند مر گیا تھا۔ اس لیے یہ کنواری بیوہ ہے۔

تو کیا اُس کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی؟

"نہیں"

"کیوں نہیں؟

بس ایسا ہی دستور ہے۔

ایسا کیسا یہ دستور ہے؟ میں نے جھلاّ کر پوچھا۔ ماں جی اگر اس وقت ہوتیں تو ضرور مجھے اس سوال پر مارتیں۔ کیونکہ اوندھے سیدھے سوال کرنے کی میری شروع سے عادت تھی۔ لیکن پتا جی مجھے میری سوال بازی پر کبھی نہ ٹوکتے تھے۔ اُلٹا خوش ہوتے تھے۔ لیکن اس وقت میرے سوال کا وہ بھی جواب نہ دے سکے اور ہنسے ہوئے گنگنانے لگے۔ "پھٹی جیب کان اس بن میں"۔ یہ اُن کا پیٹنٹ طریقہ تھا۔ جب وہ کسی سوال کا جواب نہ دینا چاہیں یا آگے بات نہ کہنا چاہیں تو اسی طرح بیچ میں سے بات چھوڑ کر گنگنانے لگتے تھے۔

"پھٹی جیب کان اس بن میں!"

اگر اُس کے سر پر بال ہوں تو وہ اور بھی اچھی لگے۔ آخر میں نے کہہ دیا۔ پتہ نہیں باپ نے اپنے بیٹے کے ذوقِ حسن کو کس نظر سے دیکھا۔ مگر اُنھوں نے اس پر بھی مجھ سے کچھ کہا نہیں۔ بدستور کچھ گنگناتے رہے۔ اتنے میں گھر آگیا اور ہم لوگ کھانے کی میز پر چلے گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔

مگر اُس دن میں نے کمپونڈر موتی رام کو اپنے دوست پورن مل شاہ سے باتیں کرتے ہوئے سُنا "شاہ جی کچھ معلوم ہے؟ ڈاکٹر صاحب کو شانو میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے!

ایں؟ یہ سچ ہے؟

بالکل۔ آج میں نے تو اپنے کانوں سے سُنا اور آنکھوں سے دیکھا۔ وہ شانو سے کہہ رہے تھے کہ تو اپنے سر کے بال بڑھا لے۔ وہ دیر تک انکار کرتی رہی مگر وہ برابر اصرار کرتے رہے۔ آخر میں وہ راضی ہو گئی اور راضی کیسے نہ

ہوتی ؟ اور جب وہ راضی ہو گئی تو ڈاکٹر صاحب مجھے الگ لے جا کر بولے بال مونڈے جانے سے اس عورت کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑا ہے یہ عورت اب اپنے آپ کو عورت ہی نہیں سمجھتی۔ میں اِس کے اندر عورت پن جگانا چاہتا ہوں تاکہ اِس کی زندگی میں تھوڑی سی خوشی آ سکے اور یہ اپنے مرض کا مقابلہ زیادہ شگفتہ دِلی سے کر سکے۔ یہ ایک نفسیاتی راز ہے موتی رام!

ڈاکٹر صاحب بڑے ماہر نفسیات ہوتے جا رہے ہیں۔ پورن مل شاہ نے طنزاً کہا۔

"ابھی آگے دیکھو اور کن امور پر یہ اپنی مہارت دکھاتے ہیں ہی ہی ہی!" موتی رام ہنس کر بولا۔

اُس کی ہنسی میں بے حد تلخی تھی جو مجھے ذرا اچھی نہیں لگی۔ اگر پتا جی نے شانو کو بال رکھنے کے لئے کہہ دیا تو کیا بُرا کیا۔ ایک بچہ بھی بتا سکتا ہے کہ عورت کے سر پر بال اچھے لگتے ہیں۔ اور جب میری ماں جی بالوں میں جوڑا کر کے اُس میں کبھی کبھار ایک پھول لگا لیتی ہیں تو وہ اور بھی اچھا لگتی ہیں۔ یہ موتی رام کی عقل کو کیا ہُوا ہے؟

موتی رام کو مجھے اپنے پاس کھڑے دیکھ کر اور اپنے دوست کی باتیں سُنتے دیکھ کر کچھ اُداس ہُوا۔ مگر اُس نے ڈھٹائی سے میرا کان پکڑ لیا اور گویا مجھے تہدیدی انداز میں سمجھاتے ہوئے بولا۔ بچو اپنی ماں کو تار دے کے بُلا لے ورنہ ڈاکٹر ہاتھ سے چلا۔ یہ کہہ کر اُس نے میرا کان چھوڑ دیا اور اپنے دوست پورن مل شاہ کے ساتھ اپنے چھوٹے سے بنگلے کی جانب چلا گیا۔

مجھے اُس کی باتوں پر سخت غصہ آیا۔ مگر میں چھوٹا سا لڑکا تھا۔ کیا کر سکتا تھا اور ماں جی تو یہاں نہ تھیں وہ تو لاہور کے ہسپتال میں پڑی تھیں۔ پتا جی ایک ماہ کی چھٹی لے کر اُن کے اپریشن کے سلسلے میں لاہور گئے تھے۔ میں بھی ساتھ گیا تھا۔ اپریشن کامیاب ہُوا تھا مگر ڈاکٹروں کا اندازہ تھا کہ ابھی ماں جی کو تین ماہ اور ہسپتال میں رہنا پڑے گا۔ پتا جی کو مزید چھٹی نہ ملی تھی اس لیے وہ ماں جی کو ہسپتال میں چھوڑ کر اپنے چھوٹے بھائی کی نگرانی میں دے کر مجھے ساتھ لے کر واپس آ گئے تھے اور آتے ہی اپنے ہسپتال کا کام سنبھال لیا تھا۔ ہر ہفتے ماں جی کی چٹھی آتی تھی جس میں میرے لیے بہت سا پیار ہوتا تھا۔ ایک بار اُنھوں نے میرے لیے قندھاری اناروں کا پارسل بھی بھجوایا تھا کیونکہ ہمارے علاقے میں قندھاری انار نہیں ہوتے تھے اور تاراں تو قندھاری انار کے دانے کھا کر حیران ہو گئی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ ہمارے جنگل کے ڈُرینوں سے بڑے انار کہیں نہیں ہوتے۔ ارے ڈُڑنی تو اِس انار کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہے۔ تاراں کو اقبال کرنا پڑا تھا اور قندھاری انار دیکھ کر اُسے لاہور کے بارے میں دوسری باتوں کے سلسلے میں بھی اب یقین کرنا پڑا تھا۔ جو میں نے واپسی پر اُسے سُنائی تھیں اور جس پر اب تک وہ کسی طرح ایمان نہ لا سکی تھی۔ لیکن قندھاری اناروں نے اُسے بالکل قائل کر دیا اور اب اس نے یہ سب کچھ سُن کر طے کر دیا کہ اب تو وہ صرف مجھی سے شادی کرے گی اور شادی کر کے لاہور جا کے رہے گی۔ لیکن اس دوران میں میرا ارادہ بدل گیا تھا۔ کیونکہ اب میں اُس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو میری ماں جی کی نرس کی سب سے چھوٹی لڑکی

تھی اور جو میرے ساتھ گیند کھیلتی تھی اور خوبصورت فراک پہنتی تھی اور بالوں میں ربن لگاتی تھی اس پر میری اور تاراں کی بہت لڑائی ہوئی تھی اور تین دن تک ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ لیکن لاہور بہت دور تھا اور یہاں تاراں کے سوا اور کوئی میرے ساتھ کھیلنے والا نہ تھا۔ اس لیے ہولے ہولے وہ خوب صورت فراک والی لڑکی میرے ذہن سے غائب ہوگئی اور مَیں پھر تاراں کے ساتھ کھیلنے لگا۔

میں نے موتی رام کی خوفناک مونچھوں کے ڈر سے پتاجی کو اُس کی باتیں نہیں بتائیں۔ موتی رام بڑا ہی کمینہ اور بدفطرت آدمی تھا۔ اور اکثر میری اُلٹی سیدھی شکایتیں کر کے مجھے ماں جی سے پٹوا دیا کرتا تھا۔ وہ نہ صرف مجھ سے بلکہ تمام بچّوں سے نفرت کرتا تھا۔ اُس کے اپنا بھی کوئی بچہ نہ تھا اور اُس کی بیوی ایک سوکھی سڑی بدمزاج عورت تھی جو دن رات کبھی مالی، کبھی چپراسی، کبھی اردلی کی بیوی سے لڑا کرتی تھی۔ میں اور تاراں اب کبھی اُن لوگوں کے گھر کے پاس بھی نہ پھٹکتے تھے۔ پھر بھی موتی رام یا اُس کی بیوی میری ماں سے شکایت کا کوئی نہ کوئی موقع نکال لیا کرتے تھے۔

شانو کے آجانے سے پتاجی کا ذوقِ تحقیق پھر سے اُبھر آیا تھا۔ وہ ویدک اور یونانی میں بھی کچھ شُدبُد رکھتے تھے اور اُنھوں نے ہر طرح کے نسخے اور کئی طرح کے علاج کے طریقے الگ الگ اور مِلا جُلا کر بھی شانو پر آزمانے شروع کر دیئے اور شانو کی صحت بہتر معلوم ہونے لگی۔

مجھے تو وہ اُس دن سے بہتر معلوم ہونے لگی تھی جس دن سے اُس کے

میرے بال بڑھنے شروع ہو گئے تھے اور اب تو اُس کے بال لاہور کی میموں کی طرح شانوں تک آ چکے تھے۔ سیاہ بل کھاتے ہوئے بالوں میں اُس کا سپید چہرہ ایک موم کی گڑیا کی طرح پُر سکون نظر آتا۔ صبح و شام وہ اپنا کھانا خود بناتی تھی۔ خود اپنے برتن صاف کرتی تھی۔ پتا جی نے اُس کے کمرے کی دونوں کھڑکیوں کے لیے نیلے رنگ کا پردہ لا کر دیا تھا۔ جس پر اُس نے خود بیل بوٹے کاڑھے تھے۔ ہوتے ہوتے اُس نے اپنے کمرے کے سامنے کے کشادہ گھاس کے قطعے کے چاروں طرف سنیتھے کی جھاڑیوں کی باڑھ لگا دی اور دو رویہ کیاریوں میں پھول لگا لیے۔ باڑھ پر زرد توری اور آل کی بیلیں بڑھالیں اور وہ جو گھر سے اکیلی آئی تھی ایک گھُٹے گھُٹے سڑے ماحول سے تباہ حال اور زندگی سے بیزار آئی ہسپتال کی کھُلی فضا میں اور ایک مہربان ڈاکٹر کی ہمدردی پا کر زندگی میں اُمید اور اُمید میں جذبہ اور جذبے میں رس ٹٹولنے لگی۔ اس سے پہلے وہ مرجانے کی خواہش لے کر آئی تھی۔ جس نے زندگی میں کچھ نہ دیکھا ہو۔ جو پندرہ برس کی عمر میں کنواری بیوہ ہو جائے۔ جس کا مستقبل ایک مُنڈے ہوئے سر کی طرح سپاٹ ہو جس کے گھر والے اُس کے مرنے کی شب و روز دُعا کرتے ہوں اُسے اگر تپ دق نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا —— شانو تو جانتی تھی کہ اُس کا جیٹھ اُسے اسی لئے ہسپتال میں لا کے چھوڑ گیا ہے تاکہ وہ اُن کی آنکھوں سے اوجھل اپنے گاؤں اور کھیتوں سے دُور مرجائے اور کسی رشتے دار کو اُس کی تیمار داری نہ کرنا پڑے اور جب وہ مرجائے گی تو اُس کا جیٹھ اُس کے مرحوم خاوند کی زمینوں پر قبضہ کرے گا جس کی وہ اب تک واحد وارث تھی۔ اس لیے اُس کا جیٹھ چاہتا

تھا کہ وہ جلد سے جلد مر جائے اور یہی شانو چاہتی تھی ۔ جب وہ ہسپتال میں آئی تھی اور شروع کے بیس پچیس دنوں میں اُس نے بھی یہی چاہا تھا کہ وہ جتنی جلدی مر جائے اُتنا ہی سب کے لئے اچھا ہے ۔کنواری بیوہ تو گھر کے لیے لعنت اور سماج کے لیے گالی اور زندگی کے لیے ایک بوجھ ہوتی ہے ۔ جتنی جلدی یہ بوجھ آگ کی نذر ہو جائے اچھا ہے ۔

مگر یہ کس طرح کا ڈاکٹر تھا جو اُسے بتا رہا تھا کہ زندگی ہر انسان کی مقدس ہوتی ہے چاہے وہ بیوہ ہو یا شادی شدہ ۔ امیر ہو یا غریب دھرتی کی لعنت وہ لوگ ہیں جو پندرہ برس کی کنواری بیواؤں کو شادی کرنے سے روکتے ہیں سماج کی گندگی وہ انسان ہیں جو غریب عورتوں کا حق مارتے ہیں اور وہی لوگ اس زندگی پر بوجھ ہیں جو کسی دوسرے کو خوش نہیں دیکھ سکتے ۔شانو نے اس مہربان مرد کی نگاہیں دیکھیں اُس کی میٹھی باتیں سُنیں اُس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا ۔جب وہ اُس کی نبض ٹٹولتا تھا اور ہولے ہولے اُس کے بجھتے ہوئے دل میں ایک شعلہ سا اُبھرنے لگا ۔ جینے کی خواہش بیدار ہونے لگی اور لحاف کے اندر راتوں کے گنگناتے سناٹے میں کسی کی تصویر اُسے پرستش کرنے پر مجبور کرنے لگی ۔ دن پر دن اُس کی کھانسی کی شدّت کم ہوتی گئی ۔ بخار کی حدّت گھٹتی گئی اور سپید دُھندلے گالوں پر سُرخی کی گلابی لہر دوڑنے لگی اور میرے پتا کو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ اس دھندلی مٹتی ہوئی تصویر میں رنگ بھر رہے ہیں جیسے وہ صرف ڈاکٹر ہی نہیں مصوّر بھی ہیں!

جب شانو کے بال کندھے تک آنے لگے تو اُس نے ایک روز شرما کر

ڈاکٹر صاحب سے ایک آئینے اور کنگھی کی فرمائش کی۔ عورت جس سے پیار کرتی ہے اُس پر اپنا حق جتائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مرد جس سے پیار کرتا ہے اُس پر حکومت جتائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا ۔۔ اس شرط پر آئینہ اور کنگھی لا کر دوں گا کہ تم خوشبودار تیل بھی استعمال کرو۔

ہائے خوشبودار تیل؟ میں ایک بیوہ خوشبودار تیل کیسے استعمال کر سکتی ہوں؟

کر سکتی ہو! کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر صاحب بولے۔ اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو زندگی اور اُس کی مہک اور اُس کی تمام خوب صورت چیزوں سے پیار کرنا ہوگا وہ لوگ کس قدر غلط ہیں جو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جب کسی عورت کا خاوند مر جاتا ہے تو اُس کی بیوہ کا جسم بھی مر جاتا ہے۔ ایسا تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے ورنہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کتنی ہی خواہش کتنی ہی تمنائیں کتنے ہی ارمان روح اور جسم کے تقاضے زندہ رہتے ہیں۔

شانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جب مرے تھے تو میں کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ میں نے تو ٹھیک طرح سے اُن کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ میں اُنھیں پہچانتی تک نہ تھی۔ مگر لوگوں نے مجھے بتایا کہ میں بیوہ ہو چکی ہوں۔ مگر میں کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب کہ میرے دل کی تو کوئی آرزو بیوہ نہ ہوئی تھی۔ پھر مجھے کیسے یقین آتا۔ مگر پندرہ سال تک وہ لوگ مجھے یقین دلاتے رہے۔ بھوکا رکھ کر طعنے دے دے کر، مار پیٹ کر مجھے دن رات کچلتے رہے اور میں اُس کھلیان کی طرح سب کے پاؤں میں مسل ڈالی گئی جس سے اناج کا آخری دانہ بھی نکال لیا ہو

کیونکہ شاستروں میں ایسا ہی لکھا ہے ۔

زندگی سے بڑا شاستر کوئی نہیں ہے!

رام رام ، کیا کہتے ہو ڈاکٹر صاحب ۔ شانو گھبرا کر بولی ۔ایسی باتیں نہ بولو ۔ پرلے آجائے گی !

مَیں تو ہر روز یہی بولتا ہوں پھر پرلے کیوں نہیں آجاتی ۔ ڈاکٹر صاحب اتنا کہہ کر ہنس کر باہر چلے گئے ۔ مگر اُن کے جانے کے بعد شانو گھبرا کر شری رام کی تصویر کے سامنے جو اُس نے اپنے کمرے میں لگا رکھی تھی ، ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور کانپتے ہوئے لہجے میں بولی ۔ ہے بھگوان ان کو معاف کر دو ۔ یہ تو ایسے ہی ہیں ۔ بے سوچے سمجھے باتیں کر جاتے ہیں ۔اُن کا جو قصور ہو اُس کی سزا مجھ کو دو ۔" یہی تو مصیبت ہے اور اِسی وجہ سے عورت پر اکثر مصیبت آتی ہے کہ وہ جس سے پیار کرتی ہے اُس کا ہر قصور ہر الزام اپنے سر پر لینے کے لیے تیار رہتی ہے اور مرد جس سے پیار کرتا ہے ۔ اُس کا کوئی قصور معاف نہیں کر سکتا ۔

جس دن ڈاکٹر صاحب نے شانو کے لیے آئینہ کنگھی اور خوشبودار تیل منگا دیا اُس دن سے ہسپتال میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں ۔ موتی رام نے اپنے دوست پورن مل شاہ سے کہا ۔

" حد ہو گئی یار ۔ آج جب شانو کنگھی چوٹی کر کے اپنے کمرے سے باہر نکلی تو ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے ہاتھوں سے اُس کے بالوں میں ڈھیلیا کا اتنا بڑا سُرخ پھول لگا دیا ۔

مگر لونڈیا کو بھی تو دیکھو۔ پورن مل بولا۔ کیسی گدرائی ہوئی ناشپاتی کی طرح بھر گئی ہے۔

ارے جیسے اچھے سے اچھا کھانے کو ملے، پہننے کو ملے ایک خوبصورت کمرہ رہنے کو ملے۔ باغ گھومنے کو ملے وہ لونڈیا ناشپاتی تو کیا، سیب کی طرح سُرخ ہو جائے تو اس میں کیا تعجب ہے؟

پھر وہ میری طرف دیکھ کر آگے بڑھا اور میرے کان کھینچ کر بولا۔ بجواب بھی کہتا ہوں۔ اپنی ماں کو بُلا لو۔ ورنہ ڈاکٹر تو گیا ہاتھ سے!

میرے پتا شانو کو دن میں چار مرتبہ دیکھنے جاتے تھے۔ ایک تو صبح اُٹھ کر جب وہ سارے وارڈوں کا راؤنڈ کرتے تھے۔ پھر دوپہر کا کھانا کھانے سے پہلے، شام کے چار بجے جب دوسری مرتبہ ہسپتال کھلتا تھا۔ پھر رات کا کھانا کھا کر اُسے دیکھنے جاتے تھے اور اکثر مرتبہ اُس وقت گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اُس کے پاس بیٹھتے تھے اور شانو گویا ہر دم اُن کی آمد کے لیے جیتی تھی اور اُنھیں دیکھ کر نہال ہو جاتی تھی۔ دو تین مرتبہ اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہاتھ سے کھانا بنا کر کھلانا چاہتی ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے منع کر دیا۔ جب تک تیرا بخار اُتر نہیں جاتا۔ میں تیرے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا نہیں کھاؤں گا۔

اور شانو نے اپنی بڑی چمکیلی ہنستی ہوئی آنکھوں سے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ اچھا یہ شرط بھی منظور ہے!

اس واقعہ کے ڈیڑھ دو ہفتے کے بعد شانو کا بخار بھی اُتر گیا۔ اور میرے پتاجی نے اُس کے ہاں کا کھانا منظور کر لیا۔ حالانکہ کھانے کا سب سامان انھوں نے اپنے گھر سے بھجوا دیا تھا۔ مگر پکایا شانو نے تھا۔ اور شانو آج ڈاکٹر صاحب کو کھانا کھلا کے بہت خوش تھی۔ . . . . اور کھانا کھلا کے فرطِ مسرت سے اُن کے پاؤں دبا تی جاتی تھی۔ اور اردلی لوگ جن کا کام ڈاکٹر صاحب کے پاؤں دبانا ہی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی اِس حماقت پر سخت حیران ہوئے

پھر شانو ڈاکٹر صاحب، کے لیے سویٹر بُننے لگی اور ہسپتال میں دھیرے دھیرے نرس کا ہاتھ بٹانے لگی تو نرس بھی جل کر خاک ہو گئی۔ اب تک نرس کے دل میں شانو کے لیے ہمدردی تھی لیکن یہ سوچ کر کہ کہیں شانو اُس کی جگہ نہ لے اُس نے چوری چھپے چغلی کٹی شُنانی شروع کر دیں۔ اب ہسپتال کا سارا عملہ اردلی، چپراسی اور نرس سے لے کر سینیئر کمپونڈر تک شانو کے خلاف ہو چکا تھا۔ مگر شانو اِن سب سے بے خبر ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ میں مگن دن بدن صحت مند ہوتی جاتی تھی۔

یہ ماحول تھا۔ جب ماں جی صحت یاب ہو کر لاہور سے لوٹیں۔ ابھی شاید وہ صحت یاب ہو کر دو ایک ماہ اور لاہور میں اپنے رشتے داروں کے یہاں رہتیں۔ مگر موتی رام کا خط پاتے ہی انھوں نے واپس آنے کی ٹھان لی اور بلا اطلاع آدھمکیں۔ ماں جی کی آمد سے میں اور پتاجی دونوں خوش ہوئے اور میں تو گویا نہال ہو کر ناچنے کودنے لگا اور ماں جی کے پیروں سے لپٹ گیا۔ انھوں نے

مجھے اپنی گود میں اُٹھا کر بہت چوما اور پیار کیا۔ مگر پتاجی سے وہ بڑی سرد مہری سے پیش آئیں۔ جس کا اُس وقت پتاجی نے کوئی خیال نہیں کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہسپتال چلے گئے۔ اور ماں جی گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئیں۔ آج وہ بات بے بات پر نوکروں کو ڈانٹ رہی تھیں کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ اُن کی غیر حاضری میں اُن کا سارا گھر چوپٹ ہو گیا تھا۔

رات کو سوتے وقت ماں جی نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے اچانک پوچھا۔

یہ شانتی کی بچی کون ہے؟

شانتی کون؟ شانو؟ پتاجی نے پوچھا

"شانو ہو گی تمہارے لیے۔ میرے لیے تو ستھا سٹری شانتی ہی ہے کب سے اس نے تمہارے دل پر سکہ جمایا ہے؟ ہیں؟"

"کیا بات کرتی ہو، کاکے دی ماں؟"

"ٹھیک کہتی ہوں۔ مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔ رب بھلا کرے موتی رام کا اُس کے گھر چاند سا بیٹا ہو۔ اُس کی بیوی کی مُراد بر آئے۔ اُس بھلے آدمی نے مجھے سب لکھ دیا ہے۔

موتی رام نے؟

ہاں ہاں موتی رام نے۔ اور موتی رام کیا چھپاتا جو ساری دنیا کو معلوم نہیں ہے؟ سارا ہسپتال تم پہ ہنس رہا ہے۔ سارا علاقہ تم پر تھو تھو کر رہا ہے۔ راج دربار تک تمہاری کرتوتوں کی خبر چلی گئی ہے۔

میں نے تو کچھ نہیں کیا۔

میں نے تو کچھ نہیں کیا؟ ماں جی طنزیہ پیرائے میں پتا جی کی بات دہراتے ہوئی بولیں۔ اس سے پہلے وہ جنم جلی سپیرن آئی تھی'' اس سے پہلے وہ خصماں کھانی کرمین تھی اب یہ شانو سر کھانو کہیں سے آگئی ہے۔ میں کہتی ہوں میں کہاں تک تمہیں سنبھالتی رہوں گی۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔

کسی کا علاج کرنے میں شرم کیا ہے؟

کسی کے بالوں میں پھول لگانا علاج ہے؟ کسی کے ہاتھ کا پکا کھانا علاج ہے؟ کسی کے پاس ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹے بیٹھ کر خوش گپیاں کرنا علاج ہے؟؟؟ اگر یہ علاج ہے تو جانے عشق معشوقی کس کو کہتے ہیں؟

کاکے دی ماں! پتا جی گرج کر بولے۔ زبان سنبھال کے بات کرو۔

ماں جی بستر سے اٹھ بیٹھیں اور پاؤں پٹک کر بولیں۔ بس نہیں مانوں گی میں نہیں مانوں گی۔ جب تک وہ کلموئی اس جگہ سے رخصت نہیں ہو جائیگی میری زبان بند نہ ہوگی جب وہ اچھی ہو جائے گی۔ خود بخود یہاں سے چلی جائیگی۔

وہ کہاں جائے گی۔ ماں جی غصے سے بولیں۔ وہ جانے کے لیے تھوڑی آئی ہے۔ وہ تو رہنے کے لیے آئی ہے۔ ابھی تو وہ نرس کا کام سیکھ رہی ہے۔ پھر نرس کی جگہ لے لیگی۔ پھر میری جگہ لیتے ہوئے اُسے کیا دیر لگتی ہے؟ اپنے خصم کو تو کھا کر یہاں آئی ہے۔ اب میرا سہاگ بھی کھانا چاہتی ہے؟ ڈائین! ـــــ میں اس کی ٹانگیں نہ چیر ڈالوں گی۔ دیکھو جی میں تم سے صاف صاف کہے دیتی ہوں۔ اُس چڑیل کو فوراً یہاں سے نکال دو۔ ورنہ کل

سے اِس گھر میں میرا اَن جل حرام ہے!!!

دوسرے دن ماں جی نے فاقہ کشی شروع کردی۔ دن میں وہ دو مرتبہ نمک ملا پانی موتی رام کے گھر سے منگا کر پیتی تھیں اور بس۔ نہ کچھ کھاتی تھیں نہ پیتی تھیں اور میں رو رو کر ہلکان ہُوا جاتا تھا اور بار بار پتا جی سے کہتا تھا کہ وہ ماں جی کو منا لیں اور پتا جی تھے کہ غصّے سے سانپ کی طرح پھنکارتے تھے اور کسی طرح سے شانو کو ہسپتال سے نکلنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ اسی لڑائی جھگڑے میں پہلا دن گزر گیا۔ دوسرا دن گزر گیا۔ تیسرا دن گزر گیا۔ چوتھے دن ماں جی بہت نحیف اور کمزور لگنے لگیں۔ اُن کے مُنہ سے بات بھی ٹھیک طرح سے نہ نکلتی تھی۔ ابھی اتنی لمبی بیماری پاکر تو وہ لاہور سے لوٹیں تھیں کہ آتے ہی یہ اُفتاد پڑی۔

میں ———————————————

پنگ پانگ کا بلا ہاتھ میں لے کر اور گیند لے کر برآمدے کی دیوار سے پنگ پانگ کھیلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں ایک نوکر نے ماں سے آکر کہا۔

شانو آپ سے ملنے کے لیے آئی ہے۔

اور پیشتر اس کے کہ ماں جی کچھ جواب دیتیں۔ شانو سر جھکائے ہوئے آنکھوں میں آنسو لیے کالے کنارے والی ایک بلگجی دھوتی پہنے خشک ہونٹوں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اندر آگئی۔ اور ماں جی کے چرن چھو کر بولیں۔

میں تو جنم جنم کی پاپن ہوں ورنہ میرا سہاگ کیوں اُجڑتا۔ میں یہاں کیوں آتی مگر اب تم مجھے معاف کر دو۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ اور اب یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔

ماں جی چپ چاپ بستر پر لیٹے اُس کے چھوٹے سے گھونگھٹ کے اندر اُس کا سپید سُتا ہُوا چہرہ دیکھتی رہیں۔ اُس کے بے رنگ گال پھیکے ہونٹ ڈوبتی ہوئی آنکھیں وہ دھندلاتے ہوئے مدھم ہوتے ہوئے نقش۔ جیسے تصویر پھر سے بگڑ رہی ہو۔

ایک اضطراری حرکت سے شانو نے اپنے پلّو میں لپٹے ہوئے سویٹر کو نکالا اور رُندھے ہوئے گلے سے بولی۔ یہ میں اُن کے لیے بُن رہی تھی۔ جو میرے لیے ہمیشہ دیوتا سے اُونچے رہیں گے۔ اگر تمھارے دل میں کسی عورت کے درد کو سمجھنے کی خواہش پیدا ہو تو اِسے اپنے ہاتھوں سے مکمل کر دینا۔ بس۔ میں تم سے اتنا ہی مانگتی ہوں

اتنا کہہ کر شانو نے وہ اَدھ بُنا سویٹر ماں کے بستر پر ڈال دیا اور اپنے ہونٹوں کو زور سے بھینچتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے یکایک وہ دہلیز کے چوکھٹے سے ٹکرائی اور اُس کی دھوتی کا پلّو اُس کے سر سے اُتر گیا۔ اُس وقت میں نے دیکھا کہ اُس کا سر مُنڈا ہُوا ہے۔

اور میں جو اب تک شانو کی کسی بات پر نہ رویا تھا۔ اس وقت پتہ نہیں کیوں میں اُس کے مُنڈے ہوئے سر کو دیکھ کر رونے لگا۔

شانو کے جانے کے بعد پتا جی کچھ چُپ چُپ سے رہنے لگے۔ کچھ بُجھ سے گئے۔ اُس کے بعد کئی مہینے تک میں نے اُن کے مُنہ سے اُن کا پسندیدہ گیت نہ سُنا۔ وہی گیت جس سے ماں جی کو اتنی چِڑ تھی۔ اب اُسی گیت کو اُن کے ہونٹوں سے سُننے کے لیے ماں جی ترستی تھیں۔ جب بھی ماں جی اِس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتی پتا جی کے مُنہ پر ایسی چُپ سی لگ جاتی کہ ماں جی اُن کا چہرہ دیکھ کر اپنی بات کو دل ہی دل میں رکھ لیتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شانو کے موضوع پر پتا جی کوئی بات سُننا نہیں چاہتے تھے۔

شانو کے جانے کے کوئی چھ ماہ بعد پتہ چلا کہ شانو اپنے گاؤں میں تپدق سے مر گئی۔ شانو کا جیٹھ اپنے کسی کام سے یہاں آیا تھا اور ہسپتال آکر ڈاکٹر صاحب کو بتا گیا تھا۔ اُسی شام ڈاکٹر صاحب کو اتنے زور کا لرزہ چڑھا کہ رات ہوتے ہوتے ایک سو پانچ درجے کا بخار ہو گیا۔ ماں جی رات بھر بیٹھی تیمار داری کرتی رہیں مگر بخار دوسرے دن بھی نہ اُترا۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ ٹائی فائڈ تھا پُورے اکیس روز کے بعد اُترا۔ لیکن جب بخار اُترا تو پتا جی بے حد نحیف و نزار ہو چکے تھے۔ وہ سُوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ سا رہ گئے۔ اور اُن کا جگر خراب ہو گیا تھا اور ان کی دونوں آنکھیں پیلی پڑ گئی تھیں۔ یرقان کا شدید حملہ تھا۔

ماں جی نے تیمار داری میں دن رات ایک کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ پتا جی کے پلنگ سے چپک کر رہ گئیں ہیں۔ خود ماں جی کی صحت پر اِس بیماری کا بہت بڑا اثر پڑا تھا۔ اور وہ جی جان سے پتا جی کو ٹھیک

کرنے کی لگن میں گھلی جاتی تھیں۔

راجہ جی ڈاکٹر صاحب پر بہت مہربان تھے اس لیے اُنھوں نے اُن کے علاج کے لیے دوسرے ڈاکٹر کو بھی بُلوا دیا تھا جو ہسپتال میں کام کرنے کے علاوہ دن رات اُن کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ نرس بھی اپنا بہت سا وقت اُن کی خبرگیری میں گزارتی تھیں۔ لاہور سے بہت سی دوائیں بھی منگائی گئی تھیں۔ خاص ڈاکٹر صاحب کے لیے۔ مگر پتا جی کے یرقان کا مرض بڑھتا جا رہا تھا اور وہ دن بدن سوکھتے جا رہے تھے۔

ماں جی نے جھاڑ پھونک گنڈے تعویذ منتر جنتر تنتر سب آزما ڈالے حکیم شمس الدین کی یونانی دوائیں بھی کھلائیں گئیں۔ وید بشورام کے شربت اور جڑی بوٹیاں بھی آزما ڈالیں۔ ڈاکٹر گردھاری لال نے جو میرے پتا جی کی جگہ آیا تھا اُس بچارے نے بھی ہر طرح کے جتن کر ڈالے۔ مگر میرے پتا کسی طرح صحت یاب ہونے میں نہ آتے تھے اور دن بدن کمزور ہوتے چلے جاتے تھے۔ اُن کی پسلیوں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ آنکھیں جو کبھی نہایت خوبصورت تھیں اب سیاہ گڈھوں میں گدلے پانی کی طرح دُھندلا گئی تھیں۔ اور اُن کے پیروں پر ورم آچلا تھا۔

ماں جی شب و روز خدمت گزاری میں منہمک رہتیں۔ باقی وقت پوجا پاٹ میں گزارتیں۔ کبھی کبھی پلو سے مُنہ ڈھانپ کر سسک سسک کر رو لیتیں۔ مگر میں نے اُنھیں کبھی پتا جی کے سامنے روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ چہرے پر ہر وقت ایک نرم مسکراہٹ رکھتیں۔ وقت پر کھانا کھلاتیں۔ وقت

پر دوا دیتیں ۔ ضرورت کے وقت پاؤں دابتیں ۔ رات کو جس وقت پتا جی کروٹ لے کر جاگتے ماں جی کو ہر وقت پائنتی پر جاگتے ہوئے پاتے ۔ ماں جی کب سوتی تھیں ۔ کب جاگتی تھیں ۔ اِس کا کسی کو پتہ نہ تھا ۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ڈاکٹر صاحب کا ہمزاد ہو کر رہ گئی ہیں ۔

پتا جی سب کچھ دیکھتے تھے ۔ مگر چُپ رہتے تھے ۔ وہی بُجھا بُجھا سُتا سا چہرہ پیلی پیلی بے نور آنکھیں ۔ پھیکے خشک ہونٹ اور ہاتھوں کی انگلیاں ہر وقت کانپتی ہوئی سی ۔ دن کو تو وہ سوتے ہی نہیں تھے لیکن رات کو بھی انہیں بہت کم نیند آتی تھی ۔ وہ لوگوں سے بہت کم بات کرتے تھے ۔ اکثر اوقات بس چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کے اندر جینے کی خواہش دب سی گئی ہے اور اُنھوں نے اپنے آپ کو بیماری کے حوالے کر دیا ہے ۔

ڈاکٹر گرِدھاری لال مایوس ہوتا گیا ۔ گھر میں گہری اُداسی کے تاریک سائے منڈلانے لگے ۔ چلتے پھرتے کام کرتے ایک دم یوں چونکنے ہو جاتے جیسے موت کی آہٹ سُن رہے ہوں ۔ دُور کسی رات اگر کسی کُتے کے رونے کی آواز آتی تو ماں جی کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگتا ۔ اور وہ دوپٹے میں اپنی چیخوں کو دبا کر اس طرح خاموشی سے روتیں کہ اُن کا سینہ درد اور خوف سے پھٹنے لگتا ۔ دھاڑیں مار کر رونے سے جی ہلکا ہوتا ہے ۔ مگر چپکے چپکے رونے سے دل پر وہ کاری ضرب پڑتی ہے کہ روح کے اندر تک اُس کی دھمک سُنائی دیتی ہے ۔

اُسی زمانے میں ایک رمتا جوگی ایک ہاتھ میں چمٹا اور ایک ہاتھ میں ترسول تھامے اور کندھے سے ایک بڑی پوٹلی لٹکائے بھیک مانگتا ہمارے برآمدے کے باہر آیا۔ ماں جی نے اُس کی جھولی میں بہت سا آٹا ڈال کر اُس سے اپنی بپتا کہہ سُنائی اُن دنوں ماں جی کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ اگر اُن کا بس چلتا تو وہ درختوں کو بھی اپنی بپتا کہہ سُناتیں۔ وہ ہر ایک کو پتا جی کی بیماری کا حال سُناتی تھیں اور کسی نئی دوا یا جڑی بوٹی کا نام سُننے کے لیے بیتاب رہتی تھیں۔

جوگی نے سب حال سُن کر کہا ـــــ "ہم بچے کو دیکھیں گے۔ دو چار جڑی بوٹیاں ہمارے پاس ہیں۔ اگر اُن میں سے کوئی کام آ گئی تو تہادلو کلیان کریں گے۔

جوگی نے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ کی اُنگلیاں دیکھیں۔ اُن کے ناخن دیکھے پیروں کے ناخن دیکھے، آنکھیں دیکھیں، کان کی لویں دیکھیں، مستک دیکھا، پھر ڈاکٹر صاحب کو آشیرواد دے کر باہر چلا آیا۔ اور سر ہلا کر ماں جی سے بولا۔

"اس کا روگ ہمارے بس کا نہیں ہے۔"

ماں جی روتے روتے ہاتھ جوڑ کر جوگی کے پاؤں پڑ گئیں رُندھے ہوئے گلے سے بولیں "کچھ تو کیجئے جوگی مہاراج!

نہیں بچی! اس کا روگ ہمارے بس کا نہیں ہے۔ اسے بھگوان ہی بچائیں تو بچائیں۔ مجھے تو اس کی آنکھوں میں یمدوت آتے دکھائی دیتے ہیں۔

ماں جی ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ شعلہ بار نگاہوں سے جوگی کی طرف دیکھ کر بولیں یمدوت آئیں تو سہی۔ ٹانگیں چیر دوں گی اُن کی۔ میں بھی کشترانی ہوں۔

میں نے بھی پرن کیا ہے۔ میرے جیتے جی موت اُن کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔

تم موت کو کیسے روک سکو گی بچی؟ جوگی نے پوچھا۔

اُن کے مرنے سے پہلے میں اپنی جان دے دوں گی۔ مگر میرے جیتے جی موت اُن کو نہ چھو سکے گی۔ ایسا میں نے پرن کیا ہے۔

ماں جی کا چہرہ غصے کی شدت اور ارادے کے استحکام سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ میں نے ماں جی کو ایسے جلال میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

جوگی اُنھیں دیکھ کر مسکرایا۔ بولا

بچی میں تیرا ارادہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ویسے اس روگ کا ایک علاج ہے مگر وہ اتنا کٹھن ہے کہ اُس کے لیے بڑے دھیرج اور پختہ ارادے کی ضرورت ہے۔

آپ بتائیے تو سہی مہاراج! ماں جی بڑی مضبوطی سے بولیں۔ میں اُس علاج کو پورا کرنے میں سارے زیور بیچ ڈالوں گی۔ اور اپنی جان کی بازی لگا دوں گی۔

اُس علاج کو برتنے میں ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوگا۔ ہاں مگر بہت کٹھن کام ہے۔ پر تمھارا ارادہ دیکھ کر تمھیں بتائے دیتا ہوں۔ جنگلوں میں ایک بیل ہوتی ہے۔ اُسے پھپھانو کی بیل کہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ کھیتوں میں بھی مل جاتی ہے۔ مگر جنگلوں میں عام ہوتی ہے۔ سب کسان لوگ اُسے جانتے ہیں۔ اس بیل میں ایک پھل لگتا ہے۔ اُسے پھپھانو کہتے ہیں۔ یہ پھل ٹماٹر سے چھوٹا ہوتا ہے لیکن شکل و صورت میں ککڑی سے بہت ملتا ہے۔ اُس کا ذائقہ کسی قدر میٹھا

کسی قدر ترش ہوتا ہے۔

ہاں ہاں میں نے پھپھانو اپنے کھیتوں میں دیکھا ہے۔ ماں جی پھر پُر اُمید ہو کر بولیں۔ بچے اسے بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

بس وہی ہے۔ جوگی بولا۔ مگر آج کل کھیتوں میں نہیں ملے گا اور ملے گا تو جنگلوں کی اُن ڈھلانوں میں جہاں دھوپ کا گزر نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ بہت سرد پھل ہے۔ اب تم ایسا کرو۔ کہ اِس علاج کو کسی دوسرے پر مت چھوڑو۔ اس کے لیے تمھیں خود سویرے اُٹھ کر جنگل جانا ہوگا اور پھپھانو کے پھلوں کی اوس جو صبح سویرے اُس پر موجود ہوتی ہے اُسے اکٹھا کر کے ایک برتن میں جمع کرنا ہوگی اور پھپھانو بھی الگ سے جمع کرنے ہوں گے۔ وہ اوس اکٹھی کر کے اُسے سُورج چڑھنے سے پہلے اپنے پتی کو پلا دو۔ پھر اُس کے آدھے گھنٹے کے بعد اُن پھپھانوؤں کا رس نکال کر اور بیج الگ کر کے اُسے پلا دو۔ مگر یہ سب کام سُورج چڑھنے سے پہلے ہونا چاہیئے۔ اگر چالیس دن تک تم یہ دوا کھلاؤ گی تو سمجھو تمہارا آج کل کر پاسے تمھارے سوامی اچھے ہو جائیں گے۔

ماں جی نے جوگی کے پاؤں چھوئے اور اُنھیں دس رُوپے کا نوٹ نذر کیا۔ مگر جوگی نے لینے سے انکار کر دیا۔ "آج کے دو وقت کی روٹی تمھارے گھر سے مل گئی۔ بس اس سے زیادہ لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اب ہم چلتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر جوگی چمٹا بجاتا ہوا گاتا ہوا ہمارے ہاں سے رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن ماں نے اپنے ایک ملازم کرپا رام کو اپنے ساتھ لیا اور ڈرینوں کے جنگل کی طرف چل دیں۔ ابھی پَو نہ پھٹی تھی وہ کرپا رام کو لے کر گھر سے رخصت

ہوگئیں تھیں۔ اور ابھی ٹھیک طرح سے اُجالا نہ ہوا تھا۔ کہ وہ پیپھانو کے پھل اور پیپھانو کا رس ایک کانسی کے ڈھکنے دار برتن میں اکٹھا کر کے لے آئیں۔ مگر وہ اتنی ہوشمند تھیں کہ ہر دوا سے پہلے ڈاکٹر گردھاری لال کی رائے ضرور لے لیتیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ڈاکٹر گردھاری لال کو فوراً بُلا بھیجا۔ وہ بے چارہ ابھی سو رہا تھا۔ مگر ماں جی کی اطلاع پاتے ہی فوراً چلا آیا۔ اچانک نیند سے اُٹھنے کی وجہ سے کچھ تلخ مزاج بھی ہو رہا تھا۔ لیکن جب اُس نے پیپھو تو دیکھے تو اکدم بھڑک گیا۔ بولا۔

یہ تو وہی ذلیل پیپھانو ہیں جنھیں پہاڑی بچے بکریاں چراتے ہوئے ہر روز جنگل سے توڑ کر کھایا کرتے ہیں۔

یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ ماں جی بڑی دلجمعی سے بولیں۔ مگر آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ ان کا رس کسی طرح کا نقصان تو نہ کرے گا۔

نقصان نہیں کرے گا تو فائدہ بھی کیا کرے گا۔ گردھاری لال نے جل کر کہا وہ تو پلانے سے معلوم ہو گا۔

جیسے آپ کی مرضی! مگر گردھاری لال نے اب پتا جی کی حالت سے مایوس ہو کر سب کچھ ماں جی پر چھوڑ دیا تھا۔ علاج تو وہ اب بھی کرتا تھا۔ اور دوا اُس کی اب بھی دی جاتی تھی۔ مگر اُس کے دل میں اب یقین نہیں تھا کہ پتا جی اچھے ہوں گے۔

ماں جی نے اُس کے دو گھونٹ میرے والد صاحب کو پلا دیئے پھر آدھے گھنٹے کے بعد پیپھانو کا رس بھی بیج نکال کر پلا دیا۔ یہ سب کام ہو جانے کے

بعد کہیں ایک گھنٹے کے بعد سورج نکلا۔ ماں جی کو بڑا اطمینان ہوا۔

بنگلے کے پچھواڑے میں ریلنگ کے قریب کے ایک اونچے پتھر پر کرپارام بیٹھا ہوا ایک سُوا لے کر اپنے کانٹے نکال رہا تھا۔ اور کوستا جاتا تھا۔ کیسا کانٹے دار جنگل ہے۔ کیسی خطرناک ڈھلانیں ہیں جہاں پھپھانو ملتے ہیں۔ کسی سیدھی سپاٹ جگہ پر تو ملتے ہی نہیں۔ کسی کھوہ کے پاس، کسی ڈھلوان میں، کسی کھڈ میں، خطرناک چٹانوں کے گہرے سایوں میں جہاں بکری بھی نہ پہنچ سکے وہاں یہ بیل اُگتی ہے۔ میرے تو پاؤں چھِل گئے۔ اور پاجامہ بھی پھٹ گیا۔ اور صبح کیسی کڑاکے کی سردی تھی۔ کمبل اوڑھ کر گیا تھا پھر بھی راستے بھر دانت بجتے رہے۔ تیری ماں تو شیرنی ہے شیرنی کالے! اسے تو جنگل میں کسی کا ڈر نہیں! کسی چٹان سے پھسل کر کھڈ میں گرنے کا خوف نہیں۔ جہاں میں نہیں پہنچ سکتا تھا وہاں یہ کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے پہنچ جاتی تھی۔ دہائی ہے۔ میں تو چالیس دن ان کے ساتھ کیسے جاؤں گا۔ تیری ماں کے سر تو جن سوار ہے مجھ سے یہ کام نہ ہو گا۔ بس تو نوکری چھوڑ دوں گا۔

وہ اسی طرح بکتا جھکتا رہا۔ مگر اس کے بعد بھی دوسرے دن گیا۔ تیسرے دن گیا۔ چوتھے دن گیا۔ پانچویں دن ہمت ہار گیا۔ ماں جی اُس روز جگت سنگھ کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ پانچ دن تک وہ بھی ساتھ جاتا رہا۔ آخر کار وہ بھی ہار گیا۔ گیارھویں روز ماں جی فیروز اور دلی کو ساتھ لے گئیں۔

اس سے پہلے یہ دستور ہوتا تھا کہ ماں پَو پھٹنے سے پہلے گھر سے چلی جاتی تھیں۔ ملازم کو ساتھ لے کر اور سورج نکلنے سے ایک گھنٹہ قبل کبھی آدھ

گھنٹہ پہلے آجاتیں بہر حال اُنھوں نے اپنے معمول میں کبھی ناغہ نہ کیا تھا اور وہ ہر سورج نکلنے سے پہلے پھپھانُو کی اوس اور اُس کا رس پتا جی کو پلا دیتی تھیں۔ کئی بار نوکروں نے اُن سے کہا۔ ماں جی آپ کے جانے کی کیا ضرورت ہے ہم خود پھپھانُو اور اُس کی اوس جنگل سے اکٹھا کر کے لے آئیں گے، تو ماں جی سر ہلا کر جواب دیتیں۔ اور اگر کسی دن تم نہ لا سکے۔ یا کسی دن تم سستی کر گئے اور پھپھانُو کے رس کے بجائے ندی کے پانی کے دو گھونٹ لے آئے تو میں کیا کروں گی۔ نہ بھائی اس معاملے میں میں کسی پر وشواش نہ کروں گی۔

گیارھویں دن ماں جی جنگل سے دیر تک نہ لوٹیں۔ نہ فیروز آیا۔ دیر تک لوگ اُن کا انتظار کرتے رہے۔ پھر سورج نکل آیا۔ پھر سورج پہاڑوں سے گز بھر اُونچا ہو گیا۔ ماں جی پھر بھی نہ آئیں۔ پتا جی نے دو ایک بار دروازے کی طرف دیکھا پھر خاموشی سے نگاہیں چھت پر لگا لیں۔

جب سورج دو گز اُونچا ہو گیا اور نوکروں کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے اور پولیس کو اطلاع دینے کی سوچنے لگے تو ہم سب نے برآمدے میں سے کھڑے ہو کر وڑینوں کے جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے بٹنگیوں کے جھاڑ کے پیچھے کی گھاٹی سے فیروزے کو دُور سے آتے ہوئے دیکھا۔ ماں جی کو اُس نے کندھے پر لاد رکھا تھا۔

بہت سے لوگ بھاگے بھاگے فیروزے کی طرف دوڑے۔ میں بھی روتا ہُوا دوڑا۔ تیز تیز چلتے ہوئے بڈھے فیروزے کی کمر دوہری ہو گئی تھی اور دم ٹوٹ

رہا تھا۔ مجید اور کرپے نے جاکر فیروزے کا بوجھ ہلکا کیا اور ماں جی کو اُٹھا کر گھر لائے۔ میں نے دیکھا کہ اُن کی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اور ہاتھوں اور پیروں سے خون بہہ رہا تھا۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ میں زور زور سے رونے لگا۔ مجید اور کرپے نے ماں جی کو پتا جی کے سامنے دوسرے پلنگ پر لٹا دیا۔ میرے زور زور سے رونے کی آواز سُن کر پتا جی نے چھت سے نگاہیں ہٹالیں اور بولے کیا ہے؟

بڈھے فیروزے نے کہا ماں جی کھڈ میں گر گئیں صاحب۔ بڑی خطرناک ڈھلوان تھی پھسلواں اور گہری اور تاریک۔ اور دُور نیچے جاکر ایک پھپھانُو کی بیل پر چار چھ پھپھانُو تو لگے ہوئے تھے اور آج جنگل سے پھپھانُو بہت کم ملے تھے۔ میں نے ماں جی کو بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہیں مانیں، میں سرکار اب بہت بڈھا ہوں۔ اتنی گہری کھڈ میں جانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ مگر یہ میری بات نہیں مانیں اور کھڈ میں اُترنے لگیں۔ اُترتے اُترتے اُن کا پاؤں جو پھسلا صاب تو بس سمجھئے جان کسی طرح بچ گئی۔ مگر چوٹیں بہت آئی ہیں صاب۔

پتا جی کسی نہ کسی طرح سے اپنے بستر سے اُٹھے اور میری ماں کے پلنگ کے قریب پہنچے۔ ماں جی پلنگ پر بے سدھ پڑی تھیں۔ اُلجھے اُلجھے رُوکھے پھیکے بال جن میں نہ تیل نہ کنگھی۔ ماتھے پر لہو کی پپڑیاں۔ میلے میلے گال۔ غم واندوہ سے دُھندلائے ہوئے۔ پتلی سوکھی باہنوں پر چوٹیں۔ نیل اور خراشیں۔ ٹانگوں سے لہو بہتا ہوا اور پاؤں کی بیائیاں پھوٹی ہوئیں۔ وہ ایسی کمزور، نحیف نازک

اور بے جان سی لگ رہی تھیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی اُنھیں دیکھتا تو پانی ہو جاتا۔

پتا جی نے دھیرے سے کہا ــــ جانکی! جانکی؟؟ ماں جی بے سدھ پڑی تھیں۔

یکایک بھرائی ہوئی آواز میں ایک چیخ مار کر پتا جی اُس بے سدھ مورت سے لپٹ گئے۔ میں نے تیرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ بڑا ظلم کیا ہے جانکی۔ مجھے معاف کر دے۔ مجھے معاف کر دے . . . میں قسم کھاتا ہوں۔ اب کبھی نہیں . . . . . اب کبھی نہیں . . . . .

ماں جی نے اپنے سوامی کی گود میں اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ کی اُنگلیوں سے میرے پتا جی کی کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی کو چھو کر کہنے لگی۔ نہیں غلطی تو مجھ سے ہوئی۔ معافی تو مجھے چاہیئے۔ میں نے سمجھا تم شانو کو محبت دے رہے ہو۔ حالانکہ تم اُسے صرف زندگی دے رہے تھے۔ مگر مجھے بہت دیر کے بعد احساس ہُوا اور اُس وقت وہ مر چکی تھی۔ اُس کی موت اور تمھارے دُکھ کی میں ذمے دار ہوں۔ مگر جو گنہگار ہوتے ہیں وہی تو معافی مانگتے ہیں۔

ماں جی اپنے آنسوؤں میں شرمائیں۔ سب نوکر سر جھکا کر باہر چلے گئے۔

پتا جی نے ایک ہاتھ سے مجھے دوسرے ہاتھ سے میری ماں کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔" اُن دنوں کو بھول جا۔ اب کبھی نہیں۔ بس اب کبھی یوں نہ ہوگا۔ اب تک میں کبھی اتنا تیرا نہ ہُوا تھا جتنا آج سے ہو گیا ہوں۔ بس اب تو کچھ باقی نہیں رہا۔ کچھ باقی نہیں رہا۔

ماں جی نے خوشی اور شرم سے پتا جی کے سینے میں سر چھپا لیا اور رونے لگیں۔ پتا جی بھی رونے لگے۔ میں بھی رونے لگا۔ کیونکہ ہم ہندوستانی ایک رونے والی قوم ہیں۔ ہماری آنکھوں میں آنسو بہت ہوتے ہیں اور ہم ہر جگہ اور ہر وقت رو سکتے ہیں۔ مگر دوسرے لوگ اکثر اسے ہماری کمزوری پر محمول کر کے ہمارے متعلق غلط اندازے لگا لیتے ہیں مگر ہم کیا کریں ابھی ہمارے دل کا جذبہ اور ہماری آنکھوں کا پانی نہیں مرا ہے۔ یقیناً جب ہم بہت زیادہ تہذیب یافتہ ہو جائیں گے تو آنسوؤں سے نفرت کیا کریں گے۔

دوپہر کے وقت ماں جی اپنے پلنگ پر بیٹھی کچھ کاڑھ رہی تھیں۔ گردھاری لال ایک کرسی پر پتا جی کے پلنگ کے قریب بیٹھے تھے اور پتا جی پلنگ پر بڑے بڑے تکیے لگائے نیم دراز حالت میں بیٹھے تھے اور ہولے ہولے گنگنا رہے تھے "کبھی جب کان اس بن میں، کبھی جب۔ . . . .

گردھاری لال نے پوچھا۔ اب کونسی دوا شروع کریں؟

پتا جی ہنس کر بولے۔ اب اگر ندی کا پانی بھی پلا دو گے تو اچھا ہو جاؤں گا اُن کے چہرے میں گہری اُمید کی جھلک تھی۔

ڈاکٹر گردھاری لال حیرت سے میرے پتا جی کی طرف دیکھنے لگے۔ میری ماں سر جھکائے کچھ کاڑھنے میں مصروف تھیں۔

یہ کیا ہے تمھارے ہاتھ میں پتا جی نے ماں جی سے پوچھا۔

ماں جی اپنے پلنگ سے اُٹھیں اور پتا جی کو اپنے ہاتھ میں لپٹی ہوئی اُون دکھاتے ہوئے بولیں۔ سوچتی ہوں وہ شانو والا سویٹر اب پورا کر دوں!

دھیرے سے پتاجی نے اُس نامکمل سویٹر کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ دھیرے سے اُنھوں نے اُس پر اپنی اُنگلیاں پھیریں اور بولے۔

ہاں اب اسے پُورا کر ڈالو۔

لیکن اُن کے لہجے میں کوئی حسرت یا دُکھ نہ تھا۔ وہ لہجہ ایسا تھا۔ جیسے کسی خوب صورت یاد کا ہوتا ہے!

۱۰

دو بیویوں والے بہادر کو جونیئر افسروں کے حلقے میں بھی پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ سرکاری تنخواہ داروں کی فہرست میں اُس کا نام بہادر علی خاں تھا مگر سب لوگ اُسے بہادو ہی کہتے تھے۔ کیونکہ کل تک وہ اس علاقے کے بڈھوں اور بزرگوں کی چلمیں بھرا کرتا تھا۔ تقریباً ننگا گھوما کرتا تھا۔ کبھی یہاں کھانا کھا لیا۔ تو کبھی وہاں کھا لیا۔ کبھی اس کے ہاں پڑ کے سو گیا۔ تو کبھی اُس کے ہاں۔ مگر بہادر پڑھنے لکھنے میں بہت ہوشیار تھا۔ اس لیے میرے باپ نے راجہ جی سے کہہ سُن کر اُس کا وظیفہ مقرر کرا دیا تھا۔ اور وہ اس وظیفے کے زور پر انٹرنس پاس کر کے لاہور سے گھر آیا تھا۔ پھر راجہ صاحب نے کسی جنون کے دَورے میں اور اپنے ہندو افسروں کی اعلانیہ مخالفت کے باوجود اُسے پرائمری سکول

کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا تھا۔ کل کا بہادر آج بہادر علی خاں بن بیٹھا تھا اور جونیئر افسروں سے ٹکر لینے کے لیے تیار تھا۔ کیونکہ لاہور سے وہ نہ صرف جے وی کی سند لے کر آیا تھا۔ بلکہ مسلم لیگی خیالات بھی لے کر آیا تھا۔ بہت سے لوگوں کو ان دونوں باتوں پر اعتراض تھا۔ مگر اُس کے خیالات سے تو سب لوگ چڑتے تھے۔ میرے پتا جی کو بھی اُس کی باتیں سخت ناپسند تھیں۔ اور اب وہ اپنی غلطی محسوس کرتے تھے۔ کہ کیوں اُنھوں نے اُس کے لیے وظیفے کے لیے راجہ جی سے سفارش کی۔

مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ بہادر اب پرائمری سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اور اپنے علاقے کا پہلا مسلمان نوجوان تھا۔ جو انٹرنس اور جے اے وی کر کے آیا تھا۔ واپس آتے ہی اُس کی شادی چودھری دین محمد مرحوم کی لڑکی گلنار سے ہوگئی۔ گلنار ایک بیوہ تھی۔ اور اُس کے حُسن وجمال کا شہرہ چاروں طرف تھا۔ اور وہ ہمارے علاقے کی ایک متمول بیوہ سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ چودھری دین محمد کے ہاں کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اور وہ مرتے وقت اپنی ساری زمین باغ اور دو گھراٹ اور ایک گھر اپنی دونوں بچیوں کے نام لکھ گیا تھا۔ گلنار کی چھوٹی بہن لیلیٰ بھی سولہ برس کی ہو چکی تھی۔ اور آہستہ آہستہ اُس کے حُسن کا شہرہ بھی سرکاری حلقوں میں ہونے لگا تھا۔ بہت سے لوگ گلنار سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ مگر گلنار نے بائیس سالہ نوجوان بہادر کو اپنا شوہر چُن لیا۔ اور دو سال کے بعد خود اپنی مرضی سے اپنی چھوٹی بہن لیلیٰ کا نکاح بھی اُس سے کر دیا۔ اور اب کل کا یتیم بہادر، بہادر علی خاں بن

بیٹھا۔ وہ پرائمری سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ دو حسین و جمیل بیویوں کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ اب وہ زمین والا تھا۔ گھر، گھراٹ والا تھا۔ اور علاقے کا باعزت اور متمول شہری تھا۔ کیا یہ امر جونیئر افسروں کو پاگل بنا دینے کے لیے کافی نہ تھا؟

اگر یہ بات جونیئر افسروں تک محدود رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ مگر منہ زور بہادر کی ہمت یہاں تک بڑھ گئی۔ کہ ایک روز اُس نے میرے پتاجی سے ٹکر لے لی۔ اور لڑنے مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔

وہ واقعہ یوں ہُوا۔ کہ میری ماں کے اصرار کرنے پر کہ بچہ اب بڑا ہو گیا ہے۔ اسے سکول بھیجنا چاہیے۔ میرے پتاجی نے بہادر کو سکول کے بعد اپنے ہاں بنگلے پر بلا بھیجا۔ میں تو دن بھر روتا رہا تھا۔ کیونکہ میں سکول جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے باغ میں کھیلنا۔ درختوں پر چڑھنا۔ ندی میں تیرنا۔ جنگلی پرندوں کے گھونسلے نوچنا زیادہ پسند تھا۔ سکول مجھے قید خانے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اور قید خانے جانا کوئی پسند نہیں کرتا۔ مگر جب پتاجی نے ماں کے اصرار پر بہادر کو بُلا بھیجا۔ تو میں بھی اُسے دیکھنے کے لیے باہر برآمدے میں نکل آیا۔ اس سے پہلے میں نے دُور دُور ہی سے بہادر کو دیکھا تھا۔ اور جو کچھ دیکھا تھا وہ مجھے پسند نہ تھا۔ بہادر کے رخسار باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ اور جبڑے اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ اور اُس کی مخروطی ٹھوڑی لوہے کے پھل کی طرح ہوا میں لہراتی تھی۔ اُس کا رنگ بھی لوہے کا سا تھا۔ اور اُس کے بڑے بڑے ہاتھ پاؤں بڑے مضبوط اور بڑی بڑی ہڈیوں والے دکھائی

دیتے تھے۔ اور کالے کالے بالوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور ہمیشہ ایک عجیب طرح سے ایک کندھا اُچکا کر خشونت آمیز نگاہوں سے لوگوں کو مستقل شبے کی نظروں سے دیکھتا ہُوا چلتا تھا۔

اس وقت بھی وہ اسی طرح چلتا ہُوا آیا۔ میرے پتاجی نے کھڑے ہو کر اور آگے بڑھ کر اُس سے مصافحہ کیا۔ بیٹھنے کے لیے اُسے آرام کرسی پیش کی۔ جس پر وہ فوراً بیٹھ گیا۔ میں اپنے باپ کی آرام کرسی کی ہتھی سے چپکا ہُوا کھڑا تھا۔ اور جب میرے باپ نے مجھے کہا۔ بیٹا۔ یہ تمھارے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ اُنھیں سلام کرو۔ تو میں سلام کرنے کے بجائے ایک بے ہنگم سی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے ٹُر ٹُر دیکھنے لگا۔ میرے سارے جسم سے پسینہ چھوٹ رہا تھا اور میں نے اپنے والد کی آرام کرسی کی ہتھی کو اور بھی زور لگا کر پکڑ لیا۔ جیسے اب وہی میرا ایک آخری سہارا ہو۔ پھر جب میرے پتاجی نے مجھ سے ذرا سختی سے کہا۔ بیٹا۔ انھیں سلام کرو۔ تو میں نے جلدی سے ہاتھ کو ماتھے تک لے جا کر اُسے سلام کیا۔ اور جلدی سے اندر بھاگ کر ماں کے پاس چلا گیا۔ اور رونے لگا۔

نہیں۔ نہیں۔ میں سکول نہیں جاؤں گا۔ میں ہرگز اس کالے ماسٹر سے نہیں پڑھوں گا!

میری ماں طرح طرح سے مجھے تسلی دیتی رہی۔ پچکارتی اور پیار کرتی رہی اور میں اپنے گندے ہاتھوں سے اپنے گدے آنسو پونچھتا رہا۔ اور ہولے ہولے روتا رہا۔ ماں جی نے چائے تیار کرا کے باہر بھجوائی۔ اتنے میں اُنھیں برآمدے

میں زور زور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اور وہ جلدی سے سب کام چھوڑ کے بھاگیں۔ اور باہر برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی اوٹ میں ہو کر سننے لگیں۔ اور میں اُن کے پیچھے کھڑا ہو کر سننے لگا۔

میرے والد کہہ رہے تھے۔ مجھے معلوم ہے۔ تم مسلمان لڑکوں کو زیاد نمبر دیتے ہو۔ اور اُنھیں اوّل کر دیتے ہو۔ تاکہ وہ سرکاری وظیفے حاصل کر سکیں تم ہندو لڑکوں سے نابرابری کا سلوک کرتے ہو!

یہ جھوٹ ہے؟ مسلمان لڑکے زیادہ محنت کرتے ہیں۔ اس لیے اوّل نمبر پر پاس ہوتے ہیں۔

پہلے کیوں نہیں ہوتے تھے۔ میرے پتا جی نے پوچھا۔

پہلے وہ پڑھتے کہاں تھے۔ سارے سکول ہندوؤں کے لڑکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ پہلا ہیڈ ماسٹر کٹر ہندو تھا۔ جان بوجھ کے مسلمان لڑکوں کو فیل کرتا تھا۔

یہ غلط ہے! جھوٹ ہے ...... تم لاہور سے جو مسلم لیگی خیالات لے کر آئے ہو۔ اُنھوں نے تمھارے دماغ کو خراب کر دیا ہے۔

بہادر بولا۔ ڈاکٹر صاحب۔ میرا دماغ مسلم لیگ نے خراب نہیں کیا ہے۔ ہندوؤں کے ظلم نے کیا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں۔ یہاں کے علاقے کی بچانوے فیصدی آبادی مسلمان ہے۔ لیکن راجہ ہندو ہے۔ افسر ہندو ہیں مشیر مال سے لے کر پٹواری تک سب ہندو ہیں۔ ساری ریاست میں ایک بھی ڈاکٹر مسلمان نہیں ہے۔

میرے پتا غصّے سے چمک کر بولے۔ اب میری روزی بھی تمہاری نظروں میں کھٹکنے لگی۔

روزی کی بات نہیں ہے۔ یہ اصول کی بات ہے! بہادر علی نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں جھکا کر کہا۔

ہمارا راجہ تمہاری نظروں میں کھٹکتا ہے۔ حالانکہ اُسی نے تمہیں وظیفہ دے کر لاہور بھیجا تھا۔

وظیفہ دیا تو مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ اُس کا فرض تھا۔

ہندو راجہ تمہیں کانٹے کی طرح چُبھتا ہے۔ لیکن حیدر آباد کے بادشاہ کی تم دن رات تعریف کرتے ہو۔ وہاں کے ہندوؤں پر جو ظلم توڑے جاتے ہیں۔ اُس کی نہ تم مذمت کرتے ہو۔ نہ تمہارے اخبار!

ہمارا بادشاہ عدل و انصاف کا پتلا ہے اُس کے خلاف جو بھی بیان اخباروں میں چھپتے ہیں۔ وہ سب فرقہ پرست ہندوؤں کے من گھڑت ہوتے ہیں۔ اُن کی تکذیب کرنا ہمارا فرض ہے!

تکذیب؟ تکذیب؟ یہ تکذیب کیا بلا ہے۔ لاہور سے بہت اُردو پڑھ کر آئے ہو۔ میں کہتا ہوں۔ تمہاری یہ مسلم لیگ والی پالیسی ہماری ریاست میں نہیں چلے گی۔ اگر کسی دن راجہ صاحب کو تمہاری کرتوتوں کا پتہ چل گیا۔ تو کان سے پکڑ کر نکال دیئے جاؤ گے۔

میں جاؤں گا۔ تو میری جگہ کوئی دوسرا آجائے گا۔ مگر میں اپنی قوم کو دھوکا نہ دوں گا۔ بہت ظلم کر لیا تم لوگوں نے۔ اب تمہارا خاتمہ نزدیک ہے!

میرے والد غصّے سے تھر تھر کانپنے لگے۔ آرام کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلّا کر بولے۔ بدمعاش۔ جس تھالی میں کھاتے ہو اُسی میں چھید کرتے ہو۔

جس تھالی کا تم ذکر کرتے ہو۔ اُس تھالی میں چھید ہی چھید ہیں اور چھیدوں کے سوا کبھی کوئی لقمہ اُس میں نہ تھا۔

نمک حرام۔ مسلم لیگی۔

سُور۔ آریہ سماجی!

یکایک بہادر بھی آرام کرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور دونوں ہاتھا پائی کرنے لگے۔ میرے والد بہت تگڑے تھے۔ مگر بہادر علی بھی کچھ کم تگڑا نہ تھا۔ بلکہ عمر میں میرے باپ سے بہت کم بھی تھا۔ زیادہ جوان اور مضبوط تھا۔ اس لیے وہ ایک کے بجائے میرے باپ کو دو گھونسے دیتا تھا۔ میری ماں چیخنے چلانے لگیں۔ اتنے میں گھر کے دو تین نوکر دوڑے آئے اور سب نے مل کر ان دونوں کو الگ کیا

دونوں غصّے اور نفرت سے کانپ رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کچّا ہی کھا جائیں گے۔

نکل جاؤ میرے گھر سے! میرے باپ نے غصّے سے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

بہادر نے دانت کٹکٹائے۔ اب اُس کے سامنے میرے والد کے علاوہ دو تین ہٹے کٹے نوکر بھی کھڑے تھے۔ مزید لڑائی کا جو نتیجہ اب ہوگا یہ وہ بھی جانتا تھا۔ مگر اُس کا غصّہ ابھی ٹھنڈا نہ ہُوا تھا۔ مارے غصّے کے اُس کے مُنہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر کسی ڈنڈے یا سوٹے کی تلاش میں نظر

دوڑائی اور جب اُسے کچھ نہ ملا۔ تو اُس نے چائے کے سیٹ کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھالیا۔ اور غصّے سے اُسے فرش پر دے مارا۔

اک زور کے جھنکار کے ساتھ ساری پیالیاں پرچیں ٹوٹ گئیں۔ اور بہادر دوسرے لمحے برآمدے سے باہر نکل گیا۔

میرے والد بڑے زود رنج تھے۔ بڑے غصیلے اور ہٹیلے تھے لیکن جتنے غصیلے تھے۔ اتنی جلدی اُن کا غصّہ اُتر بھی جاتا تھا۔ اس واقعے کے فوراً بعد ہی وہ ہسپتال چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بھی نیچے نہیں اُترے منع کروادیا تھا۔ ماں غصّے سے جلتی بُھنتی رہیں۔ اور بہادر مُسلے کو گالیاں دیتی رہیں۔

شام کو جب والد نیچے بنگلے میں آئے۔ تو ماں غم اور غصّے سے تقریباً اونچی ہوکر بولیں۔

اسی دن کے لیے کہتی تھی سانپ کو پالا نہیں کرتے!

میرے باپ نے افسردہ ہوکر کہا۔ میں نے اُسے سانپ نہیں ایک یتیم سمجھ کر اُس کی مدد کی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ مجھ سے لڑنے مرنے کے لیے آمادہ ہو جائیگا! میں نے اُس کے بھلے ہی کے لیے کہا تھا!

یہ مسلمان کسی کے مِتر نہیں ہوتے۔ تم راجہ صاحب سے کہہ کر اُسے نکلوادو۔ فوراً۔

زم۔ . . . . ! نہیں۔ کسی کی روزی پر لات مارنا اچھا نہیں ہوتا!

تمھاری اسی رحمدلی سے تو میں عاجز ہوں۔ ماں نے پیر پٹک کر کہا —

مگر یہ بتاؤ اب تم کرو گے کیا؟

کچھ بھی کروں گا۔ مگر میں اپنے بچے کو اس سکول میں نہیں بھیجوں گا۔اُس آدمی کے دل میں بہت زیادہ نفرت ہے! تھوڑی سی نفرت تو شاید ہر ایک کے دل میں ہوتی ہوگی۔ مگر اتنی گہری نفرت؟

میرے والد کے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی۔ وہ اکدم خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

پھر وہی تمھاری فلسفیوں کی سی باتیں! میری ماں نے مایوس ہو کر کہا۔ اور وہاں سے اندر چلی گئیں۔

میری ماں کے اندر جانے کے بعد فوراً ہی خواجہ علاؤالدین تشریف لے آئے خواجہ علاؤالدین سفید داڑھی والے گوری چٹی چکنی رنگت والے بڈھے تھے۔ گلہری کی طرح اُن کے دانت بھی بے حد چھوٹے چھوٹے اور سپید تھے۔ اُن کی آنکھیں بھی بڑی چھوٹی چھوٹی اور بے حد چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور ہر وقت مضطرب سی رہتی تھیں۔ خواجہ علاؤالدین راجہ جی کے منہ چڑھے مصاحب تھے بے حد خوشامدی اور تملق پسند انسان تھے۔ بڑے نرم رواں اور خوبصورت لہجے میں میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتے تھے۔ جب وہ آتے مجھے ہمیشہ گود میں اُٹھا لیتے پیار کرتے۔ جیب سے ایک روپیہ نکال کر پیش کرتے۔ مجھے خواجہ جی بے حد پسند تھے۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد خواجہ جی بولے۔

"اگر آپ کہیں تو راجہ جی کے کان تک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مگر میرے پتاجی نے اُن کا فقرہ پُورا نہیں ہونے دیا۔ جلدی سے بولے۔
"جانے دیجئے۔ غلطی میری بھی تھی۔ میں نے اُس کی نوجوانی کا لحاظ نہیں کیا۔ اُسے بہت سخت سُست کہا۔ گالیاں تک دے ڈالیں!"

"بزرگوں کا اتنا بھی حق اگر چھوٹے روا نہ رکھیں۔ تو بدتمیز کہلائیں گے!"

خواجہ جی بولے۔"آپ کے اک اشارے کی دیر ہے اگر۔۔۔۔"

"نہیں۔ نہیں۔" پتاجی پھر بات کاٹ کر بولے۔۔۔۔۔

"حیرت ہے! دُنیا کو کیا ہوتا جارہا ہے؟ ——— خواجہ جی افسردہ لہجے میں بولے:" ہمارے راجہ جی تو دھرم راج ہیں۔ شیر بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں اُن کے راج میں! وہ تو ہندوؤں مسلمانوں دونوں کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی ایک آنکھ اگر ہندو ہے تو دوسری مسلمان!"

"بے شک، بے شک!"

خواجہ جی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"گذشتہ سال قحط کے موقع پر اُنھوں نے ایک چوتھائی لگان معاف کر دیا تھا۔ اور دو ہزار غریب مسلمانوں کو کھانا کھلایا تھا۔ اور یہاں سے بڑے شہر تک کچی سڑک بنانے کے لیے سینکڑوں کسانوں کو چھ ماہ کے لیے سرکاری خرچ سے کام پر لگا دیا تھا۔

بے شک، بے شک،

اور پھر آپ ایسے بیدار مغز روشن خیال، مرنجاں مرنج ہستی سے وہ نالائق اُلجھ پڑا؟ حیرت ہے ـ آپ کیسے خاموش بیٹھے ہیں؟ ——— میں آپ کی جگہ

ہوتا تو اُسے زندہ قبر میں گڑوا دیتا۔ اُس بدفطرت کی یہ مجال کہ آپ کو ہاتھ لگائے۔ اُس کا ہاتھ کٹوا دینا چاہیے۔ سچ کہتا ہوں ـــ ڈاکٹر صاحب بخدا آپ کی تعریف مقصود نہیں ہے۔ میں نے اپنی ستر سالہ زندگی میں کئی نہایت ہی پیارے اور محبت کرنے والے ہندو دیکھے۔ لیکن آپ ایسا شریف النفس حاکم میں نے آج تک نہیں دیکھا "

" ذرّہ نوازی ہے آپ کی! " میرے والد خوش ہو کر بولے۔ ۔ ۔

" اُوپر حجرے میں چلیں گے ؟ " خواجہ صاحب نے آنکھ مار کر کہا۔ راجہ صاحب نے ڈمپل سکاچ کی ایک بوتل عنایت کی تھی۔ میں نے سوچا۔ اس حاسد زمانے میں آپ ہی ایک ایسے یارِ غار ہیں۔ جس کے ساتھ بیٹھ کر دو گھڑی غم غلط کیا جا سکتا ہے! "

" چلئے۔ چلئے " میرے والد فوراً آرام کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ایک نوکر کو آواز دے کر " ارے او حمیدے۔ دو مُرغ اچھی طرح سے بھنوا کے اُوپر پہنچا دے "

پھر وہ خواجہ علاؤالدین کی بانہہ میں بانہہ ڈالے گاتے ہوئے اوپر چلے گئے

پھٹی جیب کان اس بن میں!

" سوُر کا کلیجہ پکا کے لیجا۔ ان دونوں کے لیے! " میری ماں نے پتاجی کے جاتے ہی جل کر حمیدے سے کہا " کم بخت اس گھر میں جو آتا ہے۔ سوا ستیا ناس آتا ہے! "

حمیدا بڑا منہ پھٹ اور لاڈلا نوکر تھا۔ ۔ وہ سر کھجاتے کھجاتے بولا " ماں جی

سؤر کا کلیجہ آپ بھی تو کھائیں گی ناں ؟"

" ہائے ڈ ے اُڑ پُڑ جانیاں!" میری ماں سونٹی لے کر اُسے مارنے کو دوڑیں حمیدا ہنستا ہُوا وہاں سے بھاگ گیا۔

اس سارے قصّے سے اگر کوئی شخص بے حد خوش تھا تو وہ میں تھا اس لڑائی کی وجہ سے اب مجھے سکول نہیں جانا پڑے گا۔ اس لیے میں بے حد خوش تھا اور جب میں نے تاراں کو یہ قصّہ سُنایا۔ تو وہ بھی بے حد خوش ہوئی۔ اُس زمانے میں ہمارے علاقے میں لڑکیوں کا کوئی سکول نہ تھا۔ اور چونکہ وہ سکول نہ جا سکتی تھی۔ اس لیے وہ میرے سکول نہ جانے پر بھی بے حد خوش ہوئی۔ اُس کا روز کا ساتھی اُس کے ساتھ چُھپ کر کھیلنے والا اُس سے چھن جاتا اگر میں سکول جاتا۔ اس لیے وہ بے حد خوش تھی۔ اور اُس نے اپنی جیب ٹٹول کر مجھے مکی کا آدھا بھٹہ کھانے کو دیا۔ یہ مکی کا بھٹہ پچھلے سال کی فصل کا تھا اور پچھلے سال آگ پر بھونا گیا تھا۔ اور پچھلے سال سے تاراں کے گھر کی چوکھٹ میں اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت ایک رسّی کی ڈوری میں بندھا ہُوا پڑا تھا۔ بے حد کرکرا اور میٹھا تھا۔ میں نے مکی کا بھٹہ کھاتے ہوئے تاراں پر اپنی علمیت جتاتے ہوئے کہا۔

" تمہیں معلوم ہے۔ حیدر آباد کا راجہ مسلمان ہے!"

" جھوٹ!" تاراں میرے ہاتھ سے مکی کا بھٹہ چھین کر بولی۔" راجہ تو ہندو ہوتے ہیں۔ اور مسلمان جو ہوتے ہیں۔ وہ غریب ہوتے ہیں!"

" نہیں وہ مسلمان ہے اور عدل کا پتلا ہے!"

"غلط - پُتلا تو مٹی کا ہوتا ہے اپگلے۔" پھر تاراں کی بڑی بڑی آنکھیں متجسس نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگیں - یکایک تاراں بولی "یہ عدل کیا ہوتا ہے!"

"ایک طرح کی مٹی ہوتی ہے!" میں نے پُتلا اُس کے ہاتھ سے چھین کر اُسے مطلع کیا.......

اور وہ کالا ماسٹر کہتا تھا - میں اپنی قوم کو دھوکا نہیں دے سکتا!"

"قوم؟ —— قوم کسے کہتے ہیں!" تاراں نے پوچھا -

میں نے کہا "جیسے تم میری قوم ہو۔"

"وہ کیسے؟ واہ - بھلا - میں تمھاری قوم کیسے ہوئی جی؟ واہ!"

"کیونکہ میں تم کو دھوکا نہیں دے سکتا!"

"واہ کیسے نہیں دھوکا دیتے ہو تم - اُس دن گھاٹی سے بیریاں توڑتے وقت تم نے بلیس بیر کھائے تھے اور مجھے صرف سات دیئے تھے..... پھر میں تمھاری قوم کیسے ہوئی؟ نہیں جی - میں تمھاری قوم نہیں بنوں گی - ہرگز نہیں بنوں گی - کبھی نہیں بنوں گی۔"

یہ کہہ کر تاراں مجھ سے رُوٹھ کر الگ بیٹھ گئی - واقعی خفا ہو کر الگ بیٹھ گئی - مُنہ پھیر کر بیٹھ گئی - اور جب میں اُس کی گردن گھما کر اُس کا مُنہ اپنے سامنے لایا - تو اُس کی آنکھوں میں واقعی آنسو تھے..... میرا دل سہم گیا - میں نے اُس سے کہا -

"اچھا - آج چلو - گھاٹی پر - میں سارے بیر توڑ کر تمھیں دے دوں گا -

آج کے سارے بیر تمہارے۔ پھر تو تم میری قوم ہو گی!"

تاراں خوشی سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور تالیاں بجاتے ہوئے گھاٹی کی طرف بھاگی۔

میں اُس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔

گھاٹی کی دشوار گزار چٹانوں کے سایوں میں بیریوں کے کانٹے دار جھاڑیوں میں اودے اودے بیر مسکرا رہے تھے۔ کہیں پر ان بیریوں کا رنگ اُودا نہ تھا سیاہ تھا۔ کہیں پر نارنجی تھا۔ کہیں پر شفقتی اور جو بیریاں بالکل کچی اور کھٹی تھیں وہ سورج کی پہلی کرن کی طرح سنہری تھیں۔ اور ہر بیری میں اس کی شبنمی بوندوں کی طرح دس بارہ دانے موتیوں کی طرح لٹکے ہوئے اس طرح چمک رہے تھے۔ جیسے وہ بلیک بیریاں نہ ہوں سونے کے چھوٹے چھوٹے آویزے ہوں۔ جنھیں شوخ و شنگ شاخوں نے مسکراتے ہوئے پہن لیا ہو.....

ایک چٹان سے دوسری چٹان کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک اُونچی بلیک بیریوں کے سائے میں تاراں کو پکڑ لیا۔

تاراں میری طرف معصومیت سے دیکھ کر بولی۔ "کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے ایک بوسہ دو!"

"بوسہ کیا ہوتا ہے!"

میں نے کہا۔ "میں نے کل حمیدے کو دیکھا تھا۔ اُس نے بنگلے کے پچھواڑے میں بیگماں کو پکڑ کر اُس سے یہی کہا تھا۔

"پھر بیگماں نے کیا کہا؟" تاراں نے لاپرواہ ہو کر بیری کی ایک شاخ کی

طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

بیگماں نے کہا۔ "میں چلاؤں گی۔ شور مچادوں گی! میں نہیں دوں گی۔"

"سمجھ گئی!" تاراں بولی "۔ بکی کا بچھڑا ہو گا۔"

"نہیں پگلی! اُس کے ناں کہتے پر حمیدے نے زبردستی بیگماں کو پکڑ لیا اور اُس کے مُنہ پر اپنا مُنہ رکھدیا۔ میں کبوتروں کی چھتری کے پیچھے چھپ کر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ پھر بہت دیر کے بعد حمیدے نے بیگم کے منہ سے اپنا مُنہ الگ کیا۔ اور لمبی سانس لے کر بولا۔ ہا۔ بہت میٹھا تھا یہ بوسہ!"

"بوسہ میٹھا ہوتا ہے؟" تاراں نے پوچھا۔

"حمیدا یہی کہتا تھا۔ دیکھیں؟"

"دیکھو!"

تاراں میرے بالکل قریب آگئی۔ میں نے حمیدے کی طرح دونوں بازوؤں میں اُسے پکڑ لیا۔ اور اُس کے مُنہ پر مُنہ رکھدیا۔ اکدم سے تاراں بجلی کی طرح تڑپ کر الگ ہو گئی اور تھوکتے ہوئے بولی۔

"تھُو۔۔۔۔۔ تھُو۔۔۔ کہاں میٹھا ہے۔ یہ تو بالکل پھیکا ہے!"

میں نے بھی نا اُمیدی سے تھوکتے ہوئے کہا۔ "بالکل پھیکا ہے اور تمھارے مُنہ سے مکا کی باس آتی ہے۔"

"اور تمھارے مُنہ سے نہیں آتی ہے؟" تاراں زور زور سے تھوکتے ہوئے بولی۔

"یہ بڑے لوگ بھی کتنے جھوٹے اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔" میں نے

اُس بو سے سے بالکل مایوس ہو کر کہا۔

"سچ کہتے ہو"۔ تاراں غصے اور نفرت سے بولی۔

"ان کی عادتیں کتنی گندی ہوتی ہیں۔ اور یہ ہم بچوں کو گندہ کہتے ہیں! لو آخرے کھاؤ۔۔۔۔۔"

پہاڑی زبان میں بلیک بیریاں آخرے کہلاتی ہیں۔ میں فوراً اُچک اُچک کر آخرے توڑنے لگا۔ اور توڑ توڑ کر تاراں کی جھولی میں ڈالنے لگا جب تاراں کی جھولی نارنجی، ارغوانی اور شفقی آخروں سے بھر گئی۔ تو اس نے بڑی ادا سے اٹھلا کر کہا "اب بس کرو۔

پھر اُس نے اپنی جھولی میں سے ایک آخرا نکال کر میرے منہ میں رکھا اور کہا "کھاؤ!"

میں نے زندگی میں رس بھرے آخرے کھائے ہیں۔ اور شہد بھرے ہونٹ چومے ہیں، ہونٹ جو گلاب کی پتی کی طرح نازک تھے۔ آخرے جو سپید کریم میں دُھلے دھلائے بلور کی پیالیوں میں دمک رہے تھے۔ لب جن کی نازک تراش پر دل کا ہر تار لرز گیا تھا۔ آخرے جن کی رنگت پر یاقوت کا گماں ہوتا تھا۔ لیکن اُس ایک آخرے کی مٹھاس کا ذائقہ آج بھی زبان پر باقی ہے!

اس واقعے کے بعد بہادر علی خاں اور میرے پتا جی کے درمیان کُٹی ہو گئی دونوں نے ایک دوسرے سے بولنا چالنا بند کر دیا۔ ایک ہفتے کے بعد جب پرائمری سکول میں جلسۂ تقسیم انعامات ہُوا۔ تو میرے پتا جی اس سکول کے جلسے میں نہیں گئے۔ اس سے پہلے ہمیشہ جایا کرتے تھے۔ اور مجھے بھی لے جایا

کرتے تھے۔ بڑا عمدہ جلسہ ہوتا تھا۔ آنگن میں گردے رنگ کے تنبو اور قناتیں
تانی جاتی تھیں۔ چاروں طرف آر پار جھنڈیاں لگائی جاتی تھیں۔ پولیس اور
فوج کے سپاہی لین لگا کر دُور تک سڑک کے دونوں طرف کھڑے رہتے
تھے۔ اور جب راجہ صاحب کی سواری آتی تھی۔ تو شاہی بینڈ زور زور سے
بجنے لگتا تھا۔ اور فوج کے لوگ اٹن شن کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور راجہ صاحب
کی چمکتی ہوئی بگھی کو سلامی دیتے تھے۔ یہ بڑی شاندار بگھی تھی۔ اس کا کوچوان
بھی بڑا شاندار تھا۔ ترچھے کونے والی راجپوتی پگڑی پہنے سونے چاندی کی
جھالروں سے جھمجھاتا کوٹ پہنے ہاتھ میں چابک لیے بخشی بیراں دِتا جب
چار بیلر گھوڑوں والی بگھی کی سب سے اونچی سیٹ پر بیٹھا نظر آتا تھا۔ تو اُس
وقت وہ اپنے شاندار لباس اور باریک گل مچھوں سے راجہ صاحب سے بھی
بڑا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بعد سکول کے آنگن میں راجہ صاحب کا
استقبال ہوتا تھا۔ اور پانچویں جماعت میں فرسٹ آنے والا لڑکا راجہ
صاحب کی تعریف میں ایک نظم گا کر سناتا تھا۔ ہمیشہ یہ ایک نظم ہوتی تھی
جسے پانچویں جماعت میں فرسٹ آنے والا لڑکا سُناتا تھا اور اس نظم میں
سرکار والا اور اُس کی سات پشتوں کی تعریف ہوتی تھی۔ اس نظم کے بعد
راجہ صاحب نظم سُنانے والے لڑکے کو ہمیشہ پچیس روپیہ کا انعام دیتے
تھے۔ اس کے بعد سکول کا ہیڈ ماسٹر ہر چوتھے فقرے میں راجہ صاحب کے
الطاف واکرام کا تذکرہ کرتا ہُوا سکول کی رپورٹ پیش کرتا تھا۔ اور رپورٹ
کے شروع میں اور آخر میں سرکار کی جان و مال کو دعائیں دیتے ہوئے سرکار

انگلشیہ کے دربار میں اُن کی ترقی، اکتیس توپوں کی سلامی اور اقبال بلند اور دائم ہونے کی دعائیں مانگتا تھا۔ اس کے بعد راجہ صاحب سونے کے حرفوں میں چھپا ہُوا اپنا خطبہ صدارت پڑھتے تھے۔ جس پر کیسر چھڑ کا ہُوا تھا اُن کی آواز بڑی پتلی اور باریک تھی۔ جسے سُن کر ہنسی آتی تھی۔ مگر سب لڑکے ہنسی کو روک کر گردن جھکا کر سنتے رہتے تھے۔ اور جب خطبہ صدارت ختم ہو جاتا تھا۔ تو راجہ صاحب اپنے ہاتھ سے انعام تقسیم کرتے تھے انعام تقسیم کرنے کا طریقہ یہ تھا۔ کہ سیکنڈ ماسٹر ایک فہرست پر سے باری باری لڑکوں کے نام پڑھتا جاتا تھا۔ اور نام سُن کر سامنے کے بڑے میز پر پڑے ہوئے انعاموں میں سے ہیڈ ماسٹر اُس لڑکے کا نام دیکھ کر انعام اُٹھا لیتا تھا۔ اور راجہ صاحب کے ہاتھ میں دے دیتا تھا۔ اور لڑکا دونوں ہاتھ آگے پھیلا کر انعام وصول کر کے، جُھک کے" جے دیوا" کہتا تھا۔ اور انعام کو اپنے سینے سے چمٹائے خوشی خوشی اپنی جماعت کی ٹولی میں واپس چلا جاتا تھا۔

انعام تقسیم ہو جانے کے بعد پھر راجہ صاحب کی سلامی کا بینڈ بجتا تھا اور راجہ صاحب اپنی بگھی میں بیٹھ کر تشریف لے جاتے تھے۔ اور اُن کے جانے کے بعد ہی سکول کے بچوں میں مٹھائی بٹتی تھی۔ اُس وقت آس پاس کے دوسرے بچے بھی۔ وہ بچے بھی جو سکول میں نہیں پڑھتے تھے قناتیں اور تنبو پھلانگ کر سکول کے آنگن میں گھس آتے تھے اور مٹھائی وصول کرتے تھے۔ اور رنگ برنگی جھنڈیاں لُوٹی جاتی تھیں اور چند منٹ میں وہ سلیقے

سے سجا ہُوا وسیع آنگن میدان کارزار کی طرح لُٹا۔ بچا کھچا اور کھونا ہُوا نظر آتا تھا۔ ہم بچوں کے لیے وہ وقت سب سے عمدہ ہوتا تھا۔ جب راجہ جی چلے جاتے تھے۔ اور اُس وقت کا ایک سال سے انتظار کیا جاتا تھا۔

مگر اس بار پتاجی جلسے میں نہیں گئے۔ اور مجھے بھی نہیں لے گئے۔ اور مجھے جانے بھی نہیں دیا۔ میں نے بہت ضد کی۔ رویا۔ گایا۔ مٹی میں لوٹا۔ نہانے سے انکار کیا۔ مگر میری کسی نے ایک نہیں مانی۔ اور جب میں نے بہت ضد کی تو میری ماں نے مجھے ایک پلنگ کے پائے سے باندھ دیا۔ جہاں میں دیر تک روتا رہا۔ اور جب رو رو کر تھک گیا تو وہیں چارپائی کے پائے سے بندھا بندھا سو گیا تب میری ماں کو مجھ پر بہت پیار آیا۔ اُنھوں نے اُسی عالم میں میری رسیاں کھول کر مجھے آزاد کیا اور مجھے اپنی باہنوں میں اُٹھا لیا۔ اور میرے مُنہ کو چُومتے ہوئے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور پلنگ پر سُلا دیا۔ جہاں میں بہت دیر تک سویا رہا۔ کیونکہ میں رو رو کر بہت تھک گیا تھا۔

پتاجی نے تو راجہ صاحب سے کسی قسم کی شکایت نہیں کی تھی لیکن پھر بھی سُنتے ہیں۔ کہ راجہ صاحب کے کانوں تک باغیانہ خیالات کی بھنک پڑ گئی کیونکہ جلسۂ تقسیم اسناد کے بعد ہی راجہ صاحب نے شیخو ڈھکی کے جنگل میں شکار کا پروگرام رکھ دیا۔ شیخو ڈھکی کا وسیع جنگل انگرڈ نالے کے مغربی کنارے سے شروع ہو کر داتارہ پہاڑ کی چوٹی تک پھیلا ہُوا تھا۔ اس جنگل میں سوائے راجہ صاحب کے ہر کسی کو شکار کھیلنے کی ممانعت تھی۔ اور جنگل سے لکڑی کاٹنے کی بھی ممانعت تھی۔ اس لیے اس جنگل میں جنگلی جانور بلا روک ٹوک پھرتے

تھے اور کثرت سے پائے جاتے تھے۔ چیتے۔ بھگیاڑ۔ بھالو۔ سوئر اور ہرن کثرت سے پائے جاتے تھے۔ اور اکثر اس جنگل سے نیچے اُتر کر کسانوں کی زمینوں میں گھس آتے تھے اور فصل اور مال مویشی کا نقصان کرتے رہتے تھے۔ مگر یہ جنگل راجہ جی کی خاص شکارگاہ تھی۔ اس لیے کسی کو شکایت کرنے کی مجال نہ تھی۔ انگرڑ نالے کے مشرقی کنارے پر بہادر علی خاں کے دو گھراٹ تھے۔ جن پر علاقے بھر کی گندم پستی تھی۔ یہ دونوں گھراٹ بہت چلتے تھے۔ اور اُن پر بہادر علی خاں کے ملازم گھراٹی بیٹھتے تھے۔ اناج پسوانے کے لیے زیادہ تر عورتیں آتی تھیں۔ اور سر پر بکری کی کھالوں میں گندم بھر کر لاتی تھیں اور پن چکی سے آٹا پسوا کر گندم یا آٹے کی صورت میں گھراٹیے کو کمیشن ادا کر کے چلی جاتی تھیں۔ ان دونوں گھراٹوں کے پاس بہادر علی خاں کی دونوں بیویوں کے دھان کے کھیت تھے۔ دھان کے کھیتوں سے پرے ایک اونچی جگہ پر بہادر علی خاں کا گھر تھا۔ اس گھر کے سامنے عناب کے دو بڑے بڑے جھاڑ تھے اور ناشپاتیوں اور آڑوؤں کے پیڑ تھے۔ گھر کے پیچھے اخروٹ کے دو بڑے بڑے درخت تھے جن کے سائے میں دوپہر میں بہادر علی خاں کے مویشی آرام کرتے تھے۔ اخروٹوں کے درختوں کے عقب میں مکئی کے کھیت تھے۔ جو سیڑھیوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر بلند ہوتے ہوئے نچی ڈھکی تک چلے گئے۔ نچی ڈھکی سے اوپر پھر سرکاری شکارگاہ شروع ہو جاتی تھی۔

جس دن راجہ صاحب شکار کرنے شکارگاہ کو تشریف لے گئے۔ اُسی دن شام کے وقت ہسپتال کے قریب بڑا ہلّہ سا ہُوا۔ اور میں اُسے دیکھنے کے لیے

دوڑتا دوڑتا فوراً ہسپتال کے بڑے دروازے پر پہنچ گیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ کئی ایک شکاری تھے جو اپنے کندھوں پر بندوقیں لٹکائے چلے آرہے تھے۔ کچھ لوگ ڈبیوں کی مشعلیں جلائے آرہے تھے۔ کیونکہ پہاڑوں میں سرِشام ہی اندھیرا بڑھ جاتا ہے۔ کچھ گوجر لوگ ایک چارپائی پر ایک زخمی آدمی کو باندھے ہوئے چلے آرہے تھے۔ اور چاروں طرف دبے دبے لہجے میں کچھ کھُسر پھُسر ہو رہی تھی۔ جو میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہ لوگ ہسپتال کے بڑے پھاٹک کے اندر آکر سیمنٹی رنگ کی بجری والی سڑک پر چلنے لگے۔ جو باغ کے کنارے سے ہو کر ہسپتال کے برآمدے تک جاتی تھی۔ ہسپتال کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر انھوں نے چارپائی کندھوں سے اُتار کر برآمدے کے پکّے فرش پر رکھدی اور خود اپنا پسینہ پونچھنے لگے۔ جب میں نے دیکھا کہ زخمی آدمی کے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ اور وہ زخمی آدمی بہادر کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

اتنے میں میرے پتاجی کو بھی خبر مل گئی تھی اور وہ بھی بنگلے سے بھاگے بھاگے ہسپتال کے برآمدے تک پہنچ چکے تھے اُنھوں نے بہادر کو دیکھتے ہی اُسے آپریشن روم میں لے جانے کے لیے کہا۔ اُسی وقت ہسپتال کے چار اردلی آئے اور زخمی اور بے ہوش بہادر کو اٹھا کر ہسپتال کے اندر لے گئے۔ میں بھی آپریشن روم کے اندر جانا چاہتا تھا۔ مگر میرے پتاجی نے ڈانٹ کر ہسپتال سے باہر نکال دیا۔ پتاجی کی آواز سُن کر میں فوراً روتا ہُوا واپس اپنے بنگلے کو چلا گیا۔ حالانکہ میرا دل ہسپتال ہی

یں تھا۔

بہت رات گئے پتا جی آپریشن روم ہی میں رہے۔ کوئی چار پانچ گھنٹے کے بعد لوٹے۔ اُس وقت تک میں کھانا کھا کے ماں کے بستر میں دبک گیا تھا۔ مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ مگر میں کسی نہ کسی طرح آنکھیں جھپکتا ہوا آنکھیں ملتا ہوا نیند کو بھگانے کی کوشش کرتا رہا۔ اتنے میں میرے پتا جی آئے آکر اُنھوں نے گرم پانی سے غسل کیا۔ کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد اُنھوں نے حقہ پیا حقّہ پینے کے بعد وہ کپڑے تبدیل کر کے سونے کے کمرے میں آن پہنچے۔ پہلے تو چُپ چاپ اپنے بستر پر پڑے رہے۔ میری ماں جی بھی چُپ رہیں۔ وہ میرے پتا جی کی طبیعت جانتی تھیں۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھیں۔ کہ پتا جی خود بات کریں۔ تو اچھا ہو گا۔

کچھ دیر کے بعد میرے والد نے اپنے پلنگ پر کروٹ لی اور میری ماں کے پلنگ کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔

”کاکے دی ماں سو گئیں؟“

”اُوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔“ ماں جی لحاف سے ذرا سا مُنہ باہر نکال کر بولیں ”کیا ہے؟“

میرے پتا جی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ آہستہ سے بولے ”کاکا جاگتا ہے کہ سو گیا ہے؟“

”وہ بے چارہ تو کب کا سو گیا!“

مگر میری ساری نیند غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے لحاف کا مُنہ ذرا سا

اُٹھا رکھا تھا۔ تاکہ اچھی طرح سے ان لوگوں کی گفتگو میرے کان میں آتی رہے ورنہ اس کے علاوہ میں تو یوں سمجھئے لحاف میں بغیر ہلے جُلے پتھر کی سِل کی طرح جامد و ساکت لیٹا تھا۔

"تمھیں معلوم ہے، بہادر سخت زخمی ہُوا ہے۔"

"نہیں تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ماں جی جھوٹ موٹ حیرت سے بولیں۔ حالانکہ اُنھیں سب پتہ تھا۔

"ہاں تو وہ بہت سخت زخمی ہُوا ہے! اُس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔"

"جو جیسا کرے گا ویسی سزا پائے گا" ماں جی ذرا تیز لہجے میں بولیں۔

"تمھیں معلوم ہے بہادر کیسے زخمی ہُوا ہے؟"

"میں عورت ذات دن بھر گھر پر رہتی ہوں۔ مجھے کیا معلوم؟" ماں جی انتہائی بھولپن سے کہنے لگیں۔

پتا جی اپنے پلنگ سے ذرا اور ادھر سرک آئے۔ آہستہ آہستہ بولے۔ یہ سب کیا دھرا راجہ جی کا ہے!"

"آہستہ بولو" ماں جی اکدم پریشان ہو کر بولیں۔

"ہوں! یہاں کون سُنتا ہے!" پتا جی ذرا بلند آواز میں بولے۔

"مگر راجہ جی نے کیا کیا؟"

"سُنتے ہیں۔ راجہ جی کے شکار میں ہنکئے کم پڑ رہے تھے۔ راجہ جی نے حکم دیا۔ کہ انگھڑ نالے کے آس پاس کے گھروں سے سب نوجوان ہنکئے کے

کام کے لیے بُلوا لیے جائیں۔ کپتان گجندر سنگھ یہ حکم ملتے ہی چار سپاہی لے کر آس پاس کے گھروں میں گھس گیا۔ بہادر اُس وقت کپڑے پہن کر سکول جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اُس نے کپتان گجندر سنگھ کو بہت سمجھایا۔ کہ وہ ایک سرکاری افسر ہے۔ سکول کا ہیڈ ماسٹر ہے۔ وہ ہنکیے کا کام نہیں کر سکتا زندگی بھر اُس نے یہ کام نہیں کیا۔ اُسے اس ذلت آمیز کام کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ مگر کپتان گجندر سنگھ نہ مانا اور جب بہادر نے ذرا جیں چپڑ کی تو اُس نے اُسے رائفل کے آگے دھر لیا۔"

"ہرے رام! ہے مالکا! تو ہی سب کا رکھشک ہے۔ تیرے ہی شرن میں سب آتے ہیں! پھر کیا ہُوا؟"

"وہ چاروں سپاہی بہادر کو اور دوسرے آس پاس کے دہقانوں کو دھکیل کر جنگل میں لے گئے۔ اور اُنھیں ہنکیوں میں شامل کر دیا۔ اور کپتان گجندر سنگھ نے ایک سپاہی کی ڈیوٹی لگا دی۔ کہ وہ ہنکیوں کی اُس ٹولی کو دیکھتا رہے۔ جس میں بہادر علی خاں شامل تھا۔ اور اگر بہادر ذرا بھی بھاگنے کی کوشش کرے تو فوراً اُس کے سر پہ بندوق کا کندہ رکھ دے!"

"پھر؟"

بہادر مجبور ہو کر ہنکیوں میں گھومتا رہا گجندر سنگھ اُسے ننگے پاؤں ہی گھر سے باہر نکال لایا تھا۔ اس لیے جنگل میں گھومنے سے دوڑنے سے اور کانٹے دار جھاڑیوں سے گزرتے ہوئے بہادر کے پاؤں میں چوٹیں آ گئیں اور اُس کے ٹخنوں سے خون بہنے لگا۔ اور وہ لنگڑا کر چلنے لگا۔ پھر بھی سپاہی

نے اُسے نہیں چھوڑا۔ ہاں جب راجہ جی نے ایک چیتے کے گولی ماری اور سارے جنگل میں راجہ کی جے جے کار ہونے لگی تو سپاہی کا دھیان دوسری طرف چلا گیا۔ اور عین اُسی وقت موقعہ پاکر بہادر ہنکیوں کی ٹولی سے بھاگ نکلا۔ مگر سپاہی بھی بڑا ہوشیار تھا۔ سُنا ہے اُس نے بہادر کے گولی مار دی۔ ۔ ۔ ۔"

"ہے رام! ہے کرشن۔ ہے پرماتما۔ تیرا ہی آسرا۔ تیرا ہی آسرا۔ تو ہی سب کا مالک ہے اور پالک ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر کیا ہُوا؟"

"کچھ لوگ کہتے ہیں۔ کہ گولی کھا کر بھی بہادر بھاگتا ہی رہا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ گولی سپاہی نے نہیں ماری۔ راجہ جی نے ماری ہے۔ کچھ بھی ہو یہ ضرور درست ہے کہ کسی نے اُس کی ٹانگ میں ضرور گولی ماری ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ گولی کھا کر بھی بہادر بھاگتا رہا۔ اتنے میں اُس کے راستے میں دوسری طرف سے ایک جنگلی سوُر آگیا۔ جسے ہنکئے مخالف سمت سے ہنکا کر راجہ صاحب کی مچان کی طرف دوڑا رہے تھے۔ سوُر سیدھا سرپٹ ایسی تیزی سے بھاگتا ہُوا آرہا تھا۔ کہ زخمی بہادر کو ادھر اُدھر سرکنے کا موقع نہ ملا۔ اور وہ سوُر کے حملے ہی میں نیچے گر گیا۔ اور سوُر نے اپنی چھوٹی سی سونڈ سے پیٹھ سے کندھے تک اُس کے سارے بدن کو پھاڑ کے رکھدیا۔"

"تراہ مان! تراہ مان! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درگا ماتا میرے بچے کی خیر کریں۔ میرے سہاگ کو سلامت رکھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر کیا ہُوا؟"

"اب وہ ہسپتال میں پڑا ہے۔ میں نے اُسے بچانے کی بہت کوشش

کی ہے۔ مگر شاید ہی بچے .... اور میرا خیال ہے کہ اب وہ نہ ہی بچے تو ٹھیک ہے ......"

"ہائیں۔ ہائیں ایسے پاپی شبد کیوں بولتے ہو؟"

"اس لیے کہتا ہوں کہ راجہ صاحب نے اُس کی دونوں بیویوں کو اُس کے گھر سے اُٹھوا کر اپنے محل میں ڈال لیا ہے۔"

"ہائیں سچ؟ ___ نہیں ... نہیں ... کیا تم سچ کہتے ہو؟"

میرے پتاجی چپ رہے۔ کچھ نہیں بولے .....

بہت دیر کے بعد میری ماں بولیں "مگر یہ تو ظلم ہے۔ اندھیر ہے ..."

مگر میرے پتاجی پھر بھی کچھ نہیں بولے .....

بہت دیر کے بعد میری ماں بولیں "مگر یہ تو ظلم ہے۔ اندھیر ہے ..."

مگر میرے پتاجی پھر بھی کچھ نہیں بولے۔

"دھرتی کا کلیجہ پھٹ جائے گا! کالکے دے بابو۔ یہ تو گھور انیائے ہے!"

میرے پتاجی کے پلنگ سے کوئی آواز نہیں آئی، شاید میرے پتاجی سو گئے تھے۔

پھر میری ماں جی نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور دھیرے دھیرے سسکنے لگیں۔

میرے پتاجی کا خیال تھا۔ کہ بہادر نہیں بچے گا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہادر نے زندہ رہنے کا عزم کر لیا تھا۔ پہلے چھ سات روز تو اُس کے

زندگی اور موت کے درمیان گزرے۔ ان دنوں وہ نیم بے ہوشی اور نیم سکرات کے عالم میں سے گزرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور جب بھی چند لمحوں کے لیے اُسے ہوش آتا۔ تو زخموں کے درد سے بے قرار ہو کر ایک جانور کی طرح ڈکراتا تھا۔ اور میرے والد جلد ہی اُسے کوئی انجکشن دے کر پھر بیہوش کر دیتے تھے۔ ان چھ سات دنوں میں گاؤں گاؤں میں اُس کی دردناک داستان پہنچ چکی تھی۔ لوگ کچھ کہتے نہیں تھے۔ لیکن جوق در جوق غریب مسلمان دہقان کھدر کی میلی قمیص اور میلا کچھا پہنے کندھے پر ایک غلیظ پٹو کے لیے دُودھ لاتا تھا۔ کوئی پھل۔ کوئی کلاڑی، کوئی خالی ہاتھ بھی آتا تھا۔ مگر دعاؤں سے لبریز دل لے کے آتا تھا۔ پہلے آٹھ دس لوگ دن میں آتے تھے۔ پھر بیس تیس آنے لگے۔ پھر تو پچاس آنے لگے۔ اور دن پر دن یہ تعداد بڑھتی ہی جاتی تھی۔ یہ لوگ کچھ کہتے نہیں تھے۔ مگر اب معلوم ہوتا تھا جیسے بہادر کی زندگی اُن کی حیات کا سوال بن گئی ہے۔ اگر بہادر زندہ رہے گا۔ تو وہ بھی زندہ رہیں گے۔ اگر بہادر مر جائے گا تو وہ بھی مر جائیں گے۔ اور اُن کی آنکھوں کے سارے خواب ہمیشہ ہمیشہ کے ملک عدم سدھار جائیں گے۔ کوئی کچھ کہتا نہیں تھا۔ کسی سے شکایت نہیں کرتا تھا۔ مگر یہ سب کو معلوم تھا کہ آج گھر گھر میں بہادر کی جان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگی جا رہی ہیں!

پہلے پندرہ بیس روز تو اسی تذبذب کے عالم میں کٹے۔ اس کے بعد بہادر کی صحت نے کروٹ لی۔ اور عالم سکرات سے عالم حیات کی جانب

لوٹنے لگا۔

پھر جب اُس کا معدہ ہلکی سی غذا قبول کرنے لگا۔ تو اُس نے دھیرے دھیرے پتاجی سے بات چیت کرنا شروع کی۔ سب سے پہلے جو اُس نے سوال کیا۔ وہ گلنار اور لیلے سے متعلق تھا۔ اور پتاجی جانتے تھے۔ کہ وہ اپنی بیویوں کو کتنا چاہتا ہے۔ اُنھیں یہ بھی معلوم تھا۔ کہ وہ ہوش میں آکر سب سے پہلا سوال یہی کرے گا۔ اس لیے وہ اس کے لیے پہلے ہی سے تیار ہو چکے تھے۔ اس لیے اُس کی بات سُنتے ہی اُنھوں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"گلنار بے چاری پر تو یہ خبر سُنتے ہی دل کا دَورہ پڑ گیا۔ وہ اپنے گھر میں بستر پر لیٹی ہے۔ میں نے اُسے بستر سے اُٹھنے سے بھی منع کر رکھا ہے۔ اور لیلے کو اُس کی دیکھ بھال کے لیے لگا دیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو۔ کہ میں اس حالت میں اُنھیں یہاں بُلا بھیجوں؟

"نہیں۔۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔ ڈاکٹر صاحب مگر گلنار ٹھیک تو ہو جائیگی۔"

"بالکل فکر نہ کرو۔ بہادر۔۔۔۔۔ اس کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ تم آرام کرو۔ کسی قسم کی بات چیت کسی سے مت کرو۔ آرام کرو۔ اور اپنی زندگی کیلئے لڑو۔۔۔۔۔"

بہادر کا چہرہ اکدم بالکل جیسے پتھر کا ہو گیا۔ اُس نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں۔ اور دھیرے سے بولا "میں آخری دم تک لڑوں گا۔"

مگر کبھی کبھی اُس کے دل پر مایوسی کا غلبہ ہوتا تو میرے باپ کی طرف وہ ایسے

نگاہوں سے دیکھنے لگتا۔ جیسے میرا باپ اس کا قاتل ہو۔ جب وہ چھری، چاقو، قینچی وغیرہ لے کر اُس کے بستر کے قریب آتے یا اُسے آپریشن روم کے بستر پر لٹاتے تو اُس کی نگاہوں میں شک و شبہے کے گہرے سائے لہرانے لگتے۔ اُسے وہ سب باتیں یاد آجاتیں جو اُس روز لڑائی کے وقت اُس نے میرے پتاجی سے کی تھیں۔ اور اُس کا رنگ فق ہو جاتا۔ اور اُس کی سانس نرخرے میں پھنسنے لگتی۔ اور وہ اُس وقت میرے پتا کی ایک ایک حرکت کو نشتر کی ہر ضرب کو قینچی کی ہر چال کو غور اور شبہے سے دیکھتا جیسے میرا والد ایک ڈاکٹر نہ ہو۔ جلاد ہو۔ اور اُسے قتل کرنے جا رہا ہو۔ ہر روز جب وہ آپریشن تھیٹر میں لے جایا جاتا تھا وہ اپنے آپ کو مُردہ متصور کر لیتا تھا۔ ہر روز میرے والد اُس کے دل کی حالت تاڑ جاتے تھے۔ مگر بھانپ کر بھی خاموش رہتے تھے۔ نہ بہادر کبھی کچھ کہتا تھا۔ نہ میرے والد اُسے کوئی جواب دیتے تھے۔ اُن کی نگاہوں میں نہ کوئی انکار تھا نہ اقرار۔ نہ اُس کے شبہوں کی تکذیب نہ اُس کے دل کی تسلی اُن کی نگاہوں میں ہوتی تھی۔ وہ انتہائی خاموشی سے اپنا کام کئے جاتے تھے!

مہینہ سوا مہینہ گزر جانے کے بعد ایک روز میرے والد انتہائی پریشان حالت میں ہسپتال سے لوٹے۔ آج اُنھوں نے کھانا نہیں کھایا۔ شام کا غسل بھی نہیں کیا۔ سر درد کا بہانہ کر کے بستر پر پڑ گئے۔ میری ماں کو اُن کے سارے مُوڈ معلوم تھے۔ وہ کھانے پر اصرار کر کے آخر میں خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد سونے کے وقت تک دونوں میاں بیوی میں کوئی

بات نہیں ہوئی۔ ہاں جب گھڑی نے رات کے گیارہ بجائے۔ تو میرے والد نے آہستہ سے میری ماں کے پلنگ کی طرف کروٹ لی۔ اور بولے۔

"کاکے دی ماں سوگئیں"

"نہیں جاگ رہی ہوں!"

"کاکا سوگیا"

"وہ بے چارا تو کب کا سوگیا ہے!"

میرے والد کچھ دیر چپ رہے۔ قدرے توقف کے بعد رُک رُک کر بولے "آج خواجہ علاؤالدین آیا تھا"

"کیا کہتا تھا؟"

"راجہ صاحب کا پیغام لایا تھا"

"کیسا پیغام؟"

"راجہ صاحب نے کہلا بھیجا ہے۔ کہ بہادر کی زندگی کا خاتمہ کردیا جائے"

میری ماں سناٹے میں آگئیں۔ میرا دل بھی دھک سے رُک گیا۔ میں چیخنے ہی والا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میری ماں بہت دیر تک کچھ نہیں بولیں۔ میرے پتا جی خود بولے۔

"خواجہ علاؤالدین کہتا تھا۔ بہادر کو جیل میں ڈالنے سے یا اُسے گولی مار دینے سے رعایا میں بغاوت پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے کہو۔ کہ وہ اُس کی شہ رگ کاٹ دیں"

میری ماں نے اپنا سانس زور سے اندر کو کھینچا۔ پھر پتھر کی طرح ساکت ہو گئیں۔

"اور خواجہ علاؤالدین کہتا تھا۔ کہ یہ سب سے اچھا طریقہ ہے۔ بہادر قدرتی موت مر جائے گا۔ اور کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔ نشتر کی ایک ہلکی سی ضرب سے ایک نس یا ایک رگ کٹ گئی۔ یہاں کس کو پتہ چلتا ہے؟"

"مگر تم تو ڈاکٹر ہو۔ ڈاکٹر جان لیتے ہیں یا جان بچا لیتے ہیں؟"

"میں اس ریاست کا شاہی معالج ہوں۔ راج دربار میں عزت رکھتا ہوں۔ میرے پاس ایک بڑا بنگلہ ہے۔ ایک باغ ہے۔ دس ایکڑ زمین ہے۔ دو مالی ہیں۔ پانچ نوکر ہیں۔ عزت ہے۔ مرتبہ ہے۔ شان و شوکت ہے۔ اور یہ سب کچھ نشتر کی ایک ہلکی سی ضرب سے بچ سکتا ہے۔ کاکے دی ماں!"

میری ماں کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولیں۔

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے ایک ماہ کی مہلت مانگی ہے!"

میری ماں کا سارا جسم کانپنے لگا۔ جیسے لحاف کے اندر ہی اندر اُنھیں جاڑا لگ کر بخار چڑھ رہا ہو۔ وہ گھبرا کر بستر سے اُٹھ بیٹھیں۔ انھوں نے میرے پتا جی سے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ بھاگ کر بیڈ روم کے ملحق پُوجا کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئیں۔ اور جاتے ہی بھگوان رام کے چرنوں میں لیٹ گئیں۔

میں بھی سب کچھ بھول کر بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی ماں کو سامنے کے کمرے میں فرش پر نڈھال لیٹے دیکھ کر رونے لگا۔ یکایک میرے والد نے مجھے اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ اور جب وہ مجھے چوم کر پچکارنے لگے تو میں نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں!

ایک ماہ میں صرف ایک دن باقی تھا۔ جب میرے پتا پٹی کرنے کی غرض سے بہادر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اُن کے ساتھ دو کمپونڈر تھے دوا اور دلی تھے۔ اور آپریشن سے متعلق سارا ساز و سامان ٹرالی میں پڑا اُن کے قریب رکھا ہُوا تھا۔ مگر آج اُنھوں نے اپنا کام شروع کرنے سے پہلے سب کو باہر نکال دیا۔ اور باہر نکال کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور خود ہی اُس کے زخموں کی پٹیاں کھولنے لگے۔ بہادر کے بہت سے زخم مندمل ہو چکے تھے۔ لیکن کئی ایک زخم ابھی باقی تھے۔ ان زخموں کو میرے پتا جی نے اچھی طرح سے دھو کر صاف کیا۔ پھر ایک نشتر ہاتھ میں لے کر بولے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہادر

"جی!"

"کیا تمھیں معلوم ہے گلنار اور لیلے کہاں ہیں!"

بہادر نے سر جھکا لیا۔ دیر تک کچھ نہیں بولا۔ میرے پتا جی بولے

"میں نے جھوٹ بولا تھا"

"مجھے معلوم ہے!"

"تمھیں کس طرح معلوم ہے! تمھیں کس نے بتایا؟" میرے پتا جی حیرت سے بولے۔ کیونکہ اُنھوں نے سب کمپونڈروں اور اردلیوں کو منع کر رکھا تھا۔ "تم سے کس نے کہا؟"

"مجھ سے کسی نے نہیں کہا۔" بہادر آہستہ سے بولا۔ "لیکن مجھے معلوم ہے!"

"لیکن شاید تمھیں یہ معلوم نہیں ہے۔ کہ راجہ نے حکم دیا ہے۔ کہ تمھیں ہسپتال ہی میں ختم کر دیا جائے . . . . ."

"نہیں۔ نہیں . . . ." کمزور بہادر دونوں بازوؤں کا سہارا لیکر بیٹھ گیا۔

"ہاں۔ یہ راجہ جی کا حکم ہے . . . . . . اور آج تمھاری زندگی کا آخری دن ہے!"

بہادر غور سے ڈاکٹر صاحب کے نشتر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ نہیں۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے!"

نشتر دیر تک ہوا میں معلق رہا۔ آخر میرے پتا بہت ہی آہستہ لہجے میں بولے۔

"بہادر کیا تم چل سکتے ہو؟"

"مجھے معلوم نہیں ہے ڈاکٹر صاحب!"

"تمھاری پیٹھ کے زخم اچھے ہو چکے ہیں۔ بائیں ٹانگ کے زخم بھی بھر چکے ہیں صرف دائیں ٹانگ کا زخم باقی ہے۔ اور دائیں بازو کے جوڑ کا زخم . . . . بہادر کیا تم چل سکتے ہو؟"

"میں کہہ نہیں سکتا ڈاکٹر صاحب! اس وقت جو آپ نے کہا ہے۔ اُسے

سُن کر تو میرے بدن میں ذرا سی طاقت نہیں رہی!"

"میں تمھیں ایک چانس دیتا ہوں۔ آج رات بھر تمھارے کمرے میں کوئی نہیں آئے گا۔ میں سب سے کہدوں گا۔ کہ میں نے تمھیں نیند کی دوا دے کر سُلا دیا ہے۔ اور کوئی تمھارے کمرے میں نہ آئے۔ میں تمھارے کمرے کے باہر ڈیوٹی دینے والے اردلی کو بھی کسی بہانے اپنے گھر بُلا لوں گا۔ رات کی تاریکی میں اگر تم ـــــ کمرے سے نکل کر ـــــ باغ کے غربی کونے تک پہنچ سکو۔ تو وہاں تمھیں تمھارا دوست ایک گھوڑا لے کر ملے گا!"

بہادر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے زور سے میرے والد کا ہاتھ پکڑ لیا،۔۔۔۔

"ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب،۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!"

"میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں۔ کہ اس دھرتی پر اس راج کے دن پُورے ہو چکے۔ میں ہندو اور مسلمانوں کی تفریق کے آج بھی اتنا ہی خلاف ہوں۔ جتنا اُس دن تھا جس روز میں نے تمھیں سے لڑائی مول لی تھی۔ مگر میں آج یہ بھی کہوں گا۔ کہ کسی ہندو کو کسی مسلمان پر یا کسی مسلمان کو کسی ہندو پر ظلم کرنے کا حق نہیں ہے۔ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر ظلم کرنے کا حق نہیں ہے۔ میرے پیشے نے مجھے انسانی زندگی کی عزت کرنا سکھایا ہے۔۔۔۔۔۔ اور جس نے تمھاری عزت لی ہے۔ تم اُس کے خلاف ہر طرح سے لڑنے کا حق رکھتے ہو!"

یہ کہہ کر میرے والد نے نشتر واپس ٹرالی کی ٹرے میں رکھدی۔ اور سر

جُھکائے دھیرے سے بہادر کے کمرے سے نکل گئے۔

دوسرے دن صبح ناشتہ کر کے میں انگریزی کی اے۔ بی۔ سی والی کتاب لے کر گھر سے باہر نکلا۔ اور ماں سے کہا۔ کہ میں کل کا سبق آلو بخارے کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر یاد کرتا ہوں۔ ایک ماہ سے پتا جی مجھے ہر روز انگریزی پڑھا رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی گھر میں پتا جی مجھ سے کئی بار انگریزی میں گفتگو کرتے تھے۔ اور مجھے بھی انگریزی میں جواب دینا سکھاتے تھے۔ اور اُن کی مسلسل کوششوں سے میں اتنی چھوٹی سی عمر میں معمولی سوالات کے جواب فر فر انگریزی میں دینے لگ گیا تھا۔ اور اکثر اوقات جب ہمارے گھر میں آفیسر لوگ مہمان آتے تھے تو اُن کی ضیافت طبع کے پروگرام میں میری انگریزی کی بات چیت بھی شامل ہوتی تھی۔ میری گفتگو سُن کر سامعین دنگ رہ جاتے تھے۔ اور میں شرما کر انگشت بد نداں ہو جاتا تھا۔

انگریزی میں بات چیت تو میں ایک عرصے سے سیکھ چکا تھا۔ مگر کتابی علم مجھے بالکل نہ تھا۔ اب ایک ماہ سے میرے پتا جی نے مجھے انگریزی حرفوں کی ایک بڑی خوب صورت سی کتاب لا کے دی تھی۔ جس کے ہر صفحے پر سات رنگوں والی تصویریں تھیں۔ آج کل میں یہی کتاب پڑھ رہا ہوں۔

ماں جی میری بات سُن کر بولیں۔ " تو وہیں آلو بخارے کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر پڑھو۔ اور اِدھر اُدھر نہیں گئے تو یاد رکھنا ؟" —— ماں نے اتنا کہہ کے ہوا دور ہی سے مجھے دکھا کے ایک طمانچہ گھمایا اور میں نے

ہنس کر اُنھیں اطمینان دلانے کے لیے کہا "نہیں ماں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ وہیں بیٹھ کر اپنا سبق یاد کرتا ہوں!"

آلو بخارے کے پیڑ کے نیچے بیٹھنے کی بھی ایک وجہ تھی۔ ہمارے باغ میں یوں تو آلوچوں کے بہت سے پیڑ تھے۔ اور چیری یعنی جاپانی آلوچوں کے بھی کئی درخت تھے۔ مگر سب سے بڑا آلوچہ ہوتا ہے۔ اور جو سب سے میٹھا ہوتا ہے۔ اور جو پک کر دوسرے سے بالکل سیاہی مائل سُرخ ہو جاتا ہے اور جس کا حجم بالکل ایک آلو جتنا بڑا ہوتا ہے۔ اور جسے لوگ آلو بخارا کہتے ہیں اُس کا صرف ایک ہی پیڑ ہمارے باغ میں تھا۔ آلو بخارے سب آلوچوں میں سب سے آخر میں پکتے ہیں۔ مگر اب تو آلو بخاروں کا موسم بھی نہ تھا۔ اب تو پت جھڑ کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ چناروں کے پتے بالکل لال ہو چکے تھے۔ آلو بخارے تو کب کے ختم ہو کے ہضم ہو چکے تھے۔ پھر بھی جو میں آلو بخارے کے پیڑ ہی کے نیچے بیٹھ کے سبق یاد کرنے والا تھا۔ تو اُس کی ایک خاص وجہ تھی۔

پتا جی نے مجھے انگریزی کی جو رنگدار تصویروں والی کتاب لا کے دی تھی۔ اُس میں ایک تصویر تو بہت ہی خوبصورت تھی۔ یہ ایک انگریزی چڑیا کا گھونسلا تھا۔ اور اس کے اندر تین نہایت ہی خوب صورت چمکتے ہوئے انڈے رکھے تھے۔ بالکل چٹے سفید انڈے جن پر نیلے رنگ کے گول گول داغ تھے۔ اور بالکل ایسے ہی نیلے چتلے انڈوں والا گھونسلا میں نے آلو بخارا کی گھنی ٹہنیوں میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔ پہلے تو اُنھیں دیکھ کر

میں دیر تک خوشی سے کانپتا رہا۔ پھر میں نے ایک انڈا اُٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھا۔ ہائے وہ انڈا کس قدر خوب صورت تھا۔ میرے جی میں آیا۔ کہ میں اس انڈے کو اُٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لوں۔ مگر پھر مجھے اپنی ماں جی کی بات یاد آئی۔ ماں جی نے مجھے ایک دفعہ بُلبُل کے انڈے چرانے پر بہت بُری طرح ڈانٹا تھا۔ اور مجھے بتایا تھا۔ کہ اگر پھر کبھی تم کسی چڑیا کے انڈے چراؤ گے۔ تو سارے گھر پر آفت آجائے گی۔ اور چڑیا رو رو کر پرماتما سے فریاد کرے گی۔ اور پرماتما تم کو چڑیا کے انڈے چرانے کی بہت بڑی سزا دیں گے۔ ممکن ہے تم کسی دن چلتے چلتے گھر کا راستہ بھول جاؤ۔ یا اور کسی ایسے گھنے جنگل میں کھو جاؤ۔ جہاں سے تم کو گھر واپس آنے کا راستہ نہیں ملے گا اور تم کو پھر ایک عقاب آکر اپنے پروں میں اُٹھا کر کسی دُور دیس لے جائے گا۔

اس طرح ایک لمبی چوڑی کہانی ماں نے مجھے ڈرانے کے لیے سُنائی تھی۔ جسے سُن کر میرے دل پر اتنا گہرا اثر ہُوا تھا۔ کہ اُس دن کے بعد سے میں نے چڑیوں کے گھونسلوں سے انڈے چرانے کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی کبھی کبھار ـــــ اپنے شوق سے مجبور ہو کر انڈوں کے گھونسلوں تک پہنچ جاتا تھا۔ اور شاخوں کو پرے ہٹا کے دیر تک اُنھیں دیکھا کرتا تھا۔ لیکن یہ انڈے تو اتنے خوبصورت تھے۔ کہ میں نے زندگی میں آج تک کبھی نہ دیکھے تھے۔ ان کا شفاف سفید رنگ اور نیلے نیلے چھلکے۔ جی چاہتا تھا۔ بس انھیں فوراً اُٹھا کے جیب میں ڈال دوں مگر ماں جی کی خوفناک کہانی مجھے یاد تھی۔ اس لیے دیر تک حسرت سے ان کو دیکھنے کے بعد میں نے

سب سے پہلے اسی پیڑ کی طرف رجوع کیا۔
وہاں مجھ سے پہلے ہی تاراں پیڑ کے نیچے موجود تھی اور ہاتھ میں پیتل کی ایک چھوٹی سی کٹوری لیے ہوئے میرا انتظار کر رہی تھی۔
"اس میں کیا ہے؟" میں نے آتے ہی پوچھا۔
وہ بولی "تمھارے لیے میٹھے چاول لائی ہوں!"
"تمھارے گھر میں آج میٹھے چاول پکے ہیں؟"
"ہاں!"
"کیوں آج کوئی تیوہار ہے؟"
"نہیں۔ آج صمدو کی ماں چاول اور شکر لائی تھی۔ اور میری ماں کو دے گئی تھی۔ بول رہی تھی۔ ان کو پکا کے کھالو۔ آج ہمارا بہادر ہسپتال سے فرار ہو گیا ہے!"
بہادر ہسپتال سے بھاگ گیا ہے۔ وہ کیوں؟"
"مجھے کیا معلوم؟ تم کو معلوم ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر کے بیٹے تم ہو۔ میں نہیں ہوں!"
"مجھے تو کچھ معلوم نہیں ہے!" میں نے آزردہ ہو کر کہا۔
"مجھے تو کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ لوگ تو کبھی کچھ مجھے بتاتے ہی نہیں!"
"ہاں۔ سنا ہے۔ وہ کل رات ہی کو ہسپتال سے بھاگ کے کہیں چلا گیا ہے۔ اور آج سارے علاقے کے گھروں میں میٹھے چاول پکے ہیں!"
"بھاگنے پر میٹھے چاول کیوں پکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ میٹھے چاول پکتے ہیں۔ اور بھاگنے والے کی لمبی عمر کے لیے لوگ دعا بھی مانگتے ہیں —— لو چاول کھاؤ۔۔۔۔"

"تم بھی کھاؤ۔"

"میں تو کھا کے آئی ہوں۔ بس۔ یہ ذرا سے چاول تمہارے لیے ماں سے آنکھ بچا کے لے آئی ہوں۔"

میں چاول کھانے لگا۔ چاول واقعی بہت میٹھے تھے اور اُن میں سے عمدہ باسمتی کی خوشبو آتی تھی۔ اور اُن کا ایک ایک دانہ سونے کی طرح پیلا تھا۔ مجھے کھاتے دیکھ کر تاراں کے مُنہ میں بھی پانی آگیا۔ اور وہ بھی میرے ساتھ مل کر چاول کھانے لگی۔ بہت جلدی ہم دونوں نے پیتل کی کٹوری صاف کر دی

تاراں مُنہ پونچھتے ہوئے بولی "اب چڑھو پیڑ پہ انڈے دیکھیں گے!"

چنانچہ ہم دونوں شاخوں پر بندروں کی طرح جھولتے ہوئے اُس جگہ پہنچے۔ جہاں دو ڈال ایک دوسرے سے گویا گلے میں بانہیں ڈالے لپٹ رہے تھے۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی ڈالیاں تھیں۔ اور پتوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہم نے ڈالیاں ہٹا کر گھونسلے پر نگاہ ڈالی۔

"ہائے کتنے پیارے ہیں!" تاراں خوشی سے چلائی۔ اور بے اختیار اُس کا ہاتھ انڈوں کی طرف بڑھ گیا۔

"ہاتھ مت لگانا!"

"بس ایک انڈا اُٹھاؤں گی۔ صرف ایک انڈا۔۔۔ چڑیا کو کیا پتہ چلے گا؟"

"نہیں"! میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا" یہ انگریز چڑیا کے انڈے ہیں۔ اور انگریز چڑیا سب کچھ جانتی ہے۔ اُسے سب معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے اُس کا انڈا چرایا ہے۔ پھر وہ پرماتما کے پاس جاکر ہماری شکایت کرے گی۔ اور پرماتما ہمیں گھر کا راستہ بھلا دیں گے۔ اور ہم کسی گھنے جنگل میں کھو جائیں گے۔ جہاں سے ہم کو ایک بہت بڑا عقاب اُٹھا کر کسی دُور دیس میں جل کے ٹپک دے گا۔"

"ہائے رام!" کہہ کر تاراں چلائی۔ اُس نے میرے کہنے کے باوجود ایک انڈا اُٹھا لیا تھا۔ لیکن جب میں نے اُسے کہانی کا انجام سُنایا۔ تو گھبرا کر اُس نے انڈا چھوڑ دیا۔ میں نے لپک کر اُسے پکڑنا چاہا۔ مگر انڈا شاخوں سے پھسلتا ہُوا نیچے چلا گیا۔ اور پیڑ کے نیچے گِر کر ٹوٹ گیا!

چند لمحے کے لیے ہم دونوں بھونچکے سے رہ گئے۔ اور حیرت سے ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ پھر بے حد رنجور اور افسردہ ہو کر ہم دونوں پیڑ سے نیچے اُترے۔ اور ٹوٹے ہوئے انڈے کے خول کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ خول جگہ جگہ سے ٹوٹ کر ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اور اُس میں سے سپید اور زرد رنگ کی لیس سی بہہ کر زمین میں جذب ہو رہی تھی۔

تاراں نے سہم کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ خوف سے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ ڈرتے ڈرتے میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔" اب کیا ہوگا؟"

میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا" اب کیا ہوگا؟" اب ماں جی سے سب کہنا پڑے گا۔ وہ مشرجی کو بلائیں گی۔ مشرجی منتر پڑھیں گے۔ مجھے

ست نا جے میں تولیں گے ۔ پھر ماں جی مجھے مندر لے جائیں گی ۔ گوردوارے جائیں گے اور پھر پیر صاحب کے مزار پر جہاں میں اپنے دوست جبرے سے ملوں گا!

"اور میں کیا کروں گی ؟" تاراں خوفزدہ ہو کر بولی ۔ میری ماں تو بہت غریب ہے ۔ وہ مجھے ست نا جے میں نہیں تول سکتی ۔ وہ تو مجھے مارے گی!"

"نہیں مارے گی! تم اس سے کچھ مت کہنا ۔ میں اپنے دوست جبرے سے کہہ کر تمھارے نام کی ایک پوٹلی پیر صاحب کے مزار پر بندھوا دوں گا میرا تمھارا پاپ بھی دُھل جائے گا!"

"ہاں ۔ یہ ٹھیک ہے۔" تاراں اکدم خوش ہو کر بولی ۔ اور یکایک اس کی ساری بشاشت عود کر آئی ۔ اور اس نے ہنستے ہوئے میرا بازو تھام کر کہا "چلو ۔ آج باغ سے باہر چناروں کے جھنڈ میں کھیلیں ۔ آج لال پتوں کی بہت سی کشتیاں بنا کے ندی میں تیرائیں گے!"

ہم لوگ کشتیاں بنانے میں مصروف تھے ۔ کہ اتنے میں ہمارا ملازم حمید! دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔" چلو ماں جی تمھیں بلاتی ہیں۔"

میں نے تاراں سے کہا۔" تم یہیں بیٹھی کشتیاں بناؤ میں گھر سے ہو کے ابھی آتا ہوں!"

تاراں نے اپنی چھوٹی سی ناک پکڑ کر کہا۔" جلدی آنا!"

" ابھی آتا ہوں!"

میں حمیدا کے آگے ناچتے ہوئے چلنے لگا ۔ بلکہ دوڑنے لگا

بنگلے کے باہر برآمدے میں میرے پتاجی کھڑے تھے۔ اور میری ماں جی حیران اور پریشان کھڑی تھیں۔ اور گھر کے سارے نوکر چاکر ایک طرف قطار سی باندھے مودب سر جھکائے کھڑے تھے۔ اور ان سب لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے! — میری ماں جی رو رو کر دوپٹے کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں اور میرے پتاجی مضطرب اور پریشان حال ہو کر برآمدے میں ٹہل رہے تھے!

معلوم ہُوا بہادر کے فرار ہو جانے کا سارا الزام راجہ جی نے میرے پتاجی کے سر پر ڈال دیا تھا۔ اور انھیں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ریاست سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیا تھا۔

تینوں کمپونڈر ہاتھ باندھے عشق پیچا کی بیل سے لگ کر کھڑے تھے۔ ان کے چہرے اُداس اور زرد تھے۔ اور ان کے ہونٹ اندر کو بھنچے ہوئے تھے۔ اور ان کے قریب شاہی محل کا ایلچی راجہ کا فرمان ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ اور اس کے قریب خواجہ علاؤالدین نظریں جھکائے میرے پتاجی سے کہہ رہے تھے۔

"راجہ جی بے حد غصے میں تھے۔ وہ تو آپ کی گردن اُڑا دینا چاہتے تھے مگر میں نے منع کیا۔ پھر وہ یہ سوچ رہے تھے کہ آپ کا منہ کالا کر کے آپ کو گدھے پر بٹھا کر بازار میں گھمایا جائے اور جیل میں ڈال دیا جائے۔ میں نے پھر منع کیا۔ آخر بڑی مشکل سے وہ اس امر پر راضی ہوئے کہ آپ کو چوبیس گھنٹے کے اندر بنگلہ خالی کر کے ریاست بدر کر دیں! میں نے بہت سمجھایا

بجھایا مگر آپ جانتے ہیں۔ سارے دربار میں میں ہی ایک حق پرست اکیلا ہوں۔ جو سب کے لیے لڑتا ہوں۔ دوسرے لوگ تو بس خوشامدی ٹٹو کی طرح راجہ صاحب کی ہاں میں ہاں ملانا جانتے ہیں!"

"بجا فرمایا آپ نے!" میرے پتا جی دھیمی آواز میں لیکن تلوار کی طرح تیز دھار والی آواز میں بولے۔ پھر مڑ کر وہ میری ماں سے بولے "سامان باندھو!"

میری ماں روتے روتے اندر چلی گئیں۔ اور اندر جا کر نوکروں کو آوازیں دینے لگیں۔

خواجہ علاؤالدین بولے "راجہ جی کا حکم ہے۔ آج سے یہ نوکر بھی آپ کی تحویل میں نہیں ہیں۔ اگر آپ ان سے کوئی کام لیں گے۔ تو یہ بے چارے بھی ڈسمس ہو جائیں گے!"

"حمیدے۔ بیگم۔ امریک سنگھ۔ دِتّا۔۔۔۔۔"

میری ماں بلا رہی تھیں۔

سب لوگ سر جھکائے چپ چاپ کھڑے تھے۔ کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

میرے پتا جی نے غضب ناک نگاہوں سے خواجہ علاؤالدین کی طرف دیکھ کر کہا "کوئی ہرج نہیں ہے۔ ہم اپنا سامان خود ہی باندھ لیں گے۔ آپ اتنا کرم مجھ پر کیجیے۔ کہ سامان اٹھانے کے لیے چند مزدوروں اور میری بیوی بچے کے لیے ایک سفری پالکی اور کہاروں کا بندوبست کر دیجیے!"

خواجہ علاؤالدین نے جھک کر دست بستہ آداب بجا لاتے ہوئے کہا "میں آپ کا خادم ہوں ڈاکٹر صاحب! دو بار آپ نے میری جان بچائی ہے۔ آپ

میری چمڑی کی جوتیاں بنا کر پہن سکتے ہیں۔ کیا کروں۔ سرکار عالی کے حکم سے مجبور ہوں۔ ورنہ میں یوں بے تحیرا ہو کر آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر نہ ہوتا۔ مگر بندہ راجہ صاحب کے فرمان شاہی سے مجبور ہو کر یہاں حاضر ہوا ہے آپ گھبرائیے نہیں۔ ابھی آدھے گھنٹے میں مزدور اور پالکی آپ کے دولت خانے پر بھجوائے دیتا ہوں!"

اس کے بعد خواجہ علاؤالدین نے شاہی ایلچی کو آنکھ سے اشارہ کیا اور دونوں وہاں سے رفوچکر ہو گئے۔ میری ماں اکیلے ہی سب سامان باندھنے لگیں۔ میرے پتاجی نے اندر جا کر اُن سے کہا "سب سامان باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ضروری اور قیمتی سامان باندھ لو۔ ریاست کی حد یہاں سے پندرہ میل دُور ہے۔ ہمیں چوبیس گھنٹوں سے پہلے پہل اس سرحد سے باہر نکل جانا چاہیئے"

مگر میری ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور بدستور خاموشی سے آنسو گراتی ہوئی سامان باندھنے لگیں۔

اب تک تو میں بھونچکا کھڑا تھا۔ پھر یکایک مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے زور زور سے چلّا چلّا کر رونا شروع کیا۔

"کیا ہے منّے"۔ پتاجی نے ذرا درشت لہجے میں کہا۔

"یہ سب میرا قصور ہے!" میں نے اپنا جرم اقبال کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے انگریزی چڑیا کا انڈا چرایا تھا۔ اس لیے ہمارے گھر پر یہ آفت آئی ہے مگر پتاجی میں انڈا چرانے کی غرض سے درخت پر نہیں چڑھا تھا۔ میں اور تارا۔"

انڈا دیکھ رہے تھے - ہم اُس کو اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھ رہے تھے - کہ انڈا ہمارے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے زمین پر جا گرا ۔"

میں نے رو رو کر ساری داستان سُنائی - ماں جی اکدم سامان باندھتے باندھتے اُٹھ کھڑی ہوئیں - اور مجھے اپنی گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے بولیں "نہیں - بیٹا - اِس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے - تمہارا کوئی قصور نہیں ہے - یہ تو اپنے بھاگ ہی ایسے ہیں - یہ تو اپنے کرموں کا پھل ہے !"

یکایک میرے پتاجی گرج کر بولے "تو کیا اُسے جان سے مار دیتا ؟ کرموں کا پھل ہے ؟ کرموں کا پھل ہے ؟ اگر تجھے ایسے ہی کرم دھرم والا چاہیئے تھا تو ایک ڈاکٹر سے شادی کیوں کی تھی - ایک جلاد سے کرتیں - جو راجہ جی کے اشارے پر اُن کے ہر مخالف کا سر قلم کر دیا کرتا !"

ماں جی سہم کر بولیں "میں تم سے کب کچھ کہہ رہی ہوں - میں تو اپنے ڈرے ہوئے بچے کو بہلا رہی ہوں !" یہ کہہ کر ماں جی نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا - اور ہم دونوں مل کر رونے لگے -

پتاجی ٹپک کر کمرے سے باہر چلے گئے - ماں جی نے بہت سا ضروری سامان باندھ لیا تھا - لیکن مزدور ابھی تک نہیں آئے تھے - کوئی دو گھنٹے کے انتظار کے بعد علاؤالدین کا آدمی آیا - اُس نے آکے بتایا - کہ کہیں کوئی مزدور نہیں ملتا ہے - اور کوئی سفری پالکی والا خالی نہیں ہے !

اتنا کہہ کر وہ آدمی فوراً ایسے بھاگ گیا - جیسے اُس کے پیچھے شکاری کُتے لگے ہوں - اُس کے جانے کے بعد ہی گھر کے سارے نوکر غائب ہو گئے - نہ نوکر

تھے۔ نہ مالی تھے۔ نہ کمپونڈر تھے۔ کہیں پر کسی متنفس کی آواز نہ آتی تھی۔ سارا بنگلہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

میرے باپ نے میری ماں سے گلوگیر لہجے میں کہا "کاکے دی ماں! سارا سامان یہیں چھوڑ دو۔ اب ایسے ہی چلنا ہوگا"

یہ کہہ کر میرے پتاجی نے مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اور میری ماں کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے خاموش نگاہوں سے اُسے گھر سے باہر نکل آنے کے لیے کہہ رہے ہوں!

مرد کے پاس تو بہت کچھ ہوتا ہے۔ اُس کے دوست ہوتے ہیں اُس کا کام ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑی پھیلی ہوئی اور وسیع دُنیا ہوتی ہے۔ لیکن عورت کے پاس تو صرف اُس کا ایک گھر ہوتا ہے۔ میری ماں نے بے لبی اور مجبور نگاہوں سے میرے پتا کی طرف دیکھا۔ اور گڑگڑا کر بولیں "اگر تم اسی وقت راجہ جی کے پاس جا کے اُن کے پاؤں چھولو گے تو شاید وہ تمہیں معاف کر دیں گے!"

میرے پتاجی نے گرج کر کہا "باہر نکلو!"

میری ماں نے بالکل بے بس اور مجبور ہو کر دوبارہ اپنے ہرے بھرے گھر کی طرف دیکھا۔ دن رات کی ایک ایک لمحے کی محنت سے اُنھوں نے یہ گھر سجایا تھا۔ اس گھر میں اُن کی پوجا کا کمرہ تھا۔ اُن کا خوب صورت کچن تھا۔ اس گھر میں وہ کمرہ تھا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ اس گھر میں اُن کے صوفے تھے۔ پلنگ تھے۔ الماریاں تھیں۔ آئینے تھے۔ پردے تھے۔ ٹیبل لیمپ تھے۔ اُس کی وفا اُس کی محنت اور گھرداری کی مہک آتی تھی۔ کیسے ایک عورت اس گھر کو چھوڑ

کر جائے۔

ماں جی بلکتی ہوئی گھر کے ایک ایک سامان اور فرنیچر سے لگ کر رونے لگیں۔ جیسے کوئی آخری بار اپنے عزیزوں کے گلے سے لگ کر بچھڑ رہا ہو۔

میرے پتاجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ دھیرے سے مجھے گود میں اُٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔ باہر برآمدے سے نکل گئے برآمدے سے نکل کر باغ کی روش پر آ گئے۔ روش سے چل کر بنگلے کے بڑے پھاٹک سے گزر کر باہر سڑک پر آ گئے۔ جو ندی کو جاتی تھی۔

یکایک ماں جی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے دیوانہ وار بنگلے سے باہر نکل کر ہمارے پیچھے پیچھے بھاگیں۔ اُن کی ساڑھی راستے میں اُلجھ گئی تھی۔ اور وہ اپنا ایک چھوٹا سا بکسا تھامے گرتے گرتے بچیں۔ پتاجی نے رُک کر سڑک پر اُن کی طرف دیکھا اور پھر آگے چلنے لگے۔ ماں جی روتی روتی پیچھے آنے لگیں۔

سڑک سنسان تھی۔ اس وقت پچاسوں آدمی اس سڑک پر چلتے ہوئے ملتے تھے۔ مگر آج اس سڑک پر کوئی نہ تھا۔ ایک گوالا بڑنگ کے درخت کے نیچے گائیں بھینسیں چرا رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ کھیتوں میں چھُپ گیا۔

گھاٹی سے اُتر کر جب ہم نیچے کے راستے پر پہنچے۔ تو بھی راستے میں ایک خچر والا ملا۔ جو تین خچروں کو آگے لگائے اُنھیں سونٹی سے ہنکاتا ہُوا کچھ گنگناتا ہُوا چلا جا رہا تھا۔ پتاجی نے اُسے روک کر کہا۔

"اے خچر والے ہمیں سرحد تک لے چلو گے؟"

"کیوں نہیں سرکار!" خچر والے نے فوراً پہاڑی دھیانی میں کہا۔ لیکن جب

اُس نے غور سے میرے والد کی صورت دیکھی۔ تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے گھبرا کر بولا۔ "نہیں سرکار۔ نہیں۔ میں —— میرے تو خچر خالی نہیں ہیں۔ میں تو ندی کے اُس پار نہیں جا رہا ہوں۔ ندی کے اس پار ہی رہ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اُچک کر ایک خچر پر بیٹھ گیا۔ اور تینوں خچروں کو زور سے ہنکلتے اور دوڑاتے ہوئے بہت آگے نکل گیا۔

ندی کے کنارے دھان کے کھیت تھے۔ اور دھان کے کھیتوں سے پرے کسانوں کے چند گھر ایک جھُنڈ کی صورت میں ایک اُونچی جگہ پر کھڑے تھے جب ہم ان گھروں کے قریب سے گزرنے تو کیا دیکھا۔ کہ کسانوں نے گھروں کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ اور باہر کی کچی گلی میں کوئی نہیں ہے۔ صرف چند کسان سر جھکائے کھڑے ہیں اور ہم سے آنکھیں تک نہیں ملا رہے ہیں۔

میرے پتا جی۔ مَیں اور میری ماں جی ہم تینوں اُن کے قریب سے گزرنے لگے۔ تو چند کسانوں نے آگے بڑھ کر میرے پتا جی کے قدم چھُو لیے۔ وہ زبان سے کچھ نہیں بولے۔ اور وہ اس لیے نہیں بولے۔ کہ ابھی اُن کا وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ صرف آنکھوں سے رو سکتے تھے!

ندی پر پہنچکر میرے پتا جی نے مجھے اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔ اور میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر ندی عبور کرنے لگے۔ خزاں کے دن تھے۔ اس لیے پانی کہیں بہر گہرا نہ تھا۔ مگر جگہ جگہ پر بے حد تیز تھا۔ اور تہ کے نیلے نیلے پتھر پھسلے ہوئے سے تھے۔ دو بار میری ماں اُن پتھروں پر پھسل کر پانی میں گر گئیں اور اُن کے سارے کپڑے بھیگ گئے۔

ندی کے اُونچے کنارے پر پہنچکر میری ماں نے ایک پیڑ کی آڑ میں اپنے گیلے کپڑے نچوڑ نے اور پھر فوراً ہی اُنھیں پہن لیا اب ہم لوگ جلدی جلدی قدم بڑھاکر قدرت شاہ کی ڈھکی پر چڑھنے لگے۔ کبھی تو میں پیدل چلتا تھا اور جب تھک جاتا تھا تو میرے والد مجھے اُٹھالیتے تھے۔ اور جب میرے والد تھک جاتے تھے تو میری ماں مجھے اُٹھالیتی تھیں۔ اور جب وہ دونوں تھک جاتے تھے تو میں خود چلنے لگتا تھا۔

جب ہم قدرت شاہ کی ڈھکی پر پہنچے۔ تو سورج نصف النہار پر تھا۔ اس اونچی ڈھکی پر پہنچ کر جب ہم نے مڑکر دیکھا۔ تو ہمارے سامنے علاقے کی ساری وادی تھی۔ اُس کے خوب صورت دھان کے کھیت۔ دھان کے کھیتوں میں بل کھاتی شفاف ندی، ندی کے پار گھاٹی پر خوشنما درختوں سے گھرا ہُوا ہمارا بنگلہ تھا۔ اور باغ کے غربی کونے پر چناروں کے چار درخت کھڑے تھے۔ جن کے نیچے میں تاراں کو کشتیاں بنانے چھوڑ آیا تھا۔ تاراں جو شعلہ رو چناروں کے نیچے بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی!

میں نے وادی کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور رو کر کہا، "ماں مجھے گھر لے چلو۔ ماں۔ میں گھر جانا چاہتا ہوں!"

میری ماں نے آنسو پی لیے اور میرے باپ کی طرف دیکھا۔ میرے پتا فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے ایک نگاہ سے انھوں نے ساری وادی کو گویا اپنے دل میں سمیٹ لیا۔ پھر فوراً مڑکر میری ماں سے بولے "آرام کرنے کا وقت نہیں ہے آدھا دن گزر چکا ہے۔ اور ہمیں شام ہوتے ہوتے ریاست کی سرحد سے

باہر نکل جانا چاہیئے۔ اور ابھی دس میل کا سفر باقی ہے!"

میرے پتاجی نے مڑ کر سامنے آنے والے راستے کی جانب دیکھا۔ سامنے کا راستہ پیر پنجال کے پہاڑ کی چوٹی تک جاتا تھا۔ جہاں تک راجہ جی کی ریاست کی سرحد تھی۔ مگر سامنے سیدھی سکھڑ چڑھائی تھی۔ راستہ بے ریش و بے رودت اور ننگا تھا۔ کہیں پر ایک جھاڑی ایک پیڑ کا سایہ تک نہ تھا۔ چاروں طرف دھوپ کھلی اور تیز تھی۔

اُٹھو۔ اُٹھو۔ اب آرام کرنے کا وقت نہیں ہے! میرے پتاجی پھر سختی سے بولے۔

میری ماں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اک آخری نگاہ سے اُنھوں نے ایسے گرسنہ انداز میں وادی کی طرف دیکھا۔ جیسے اُسے اُٹھا کر اپنے دل میں رکھ لیں گے۔ پھر مڑ کر شرربار نگاہوں سے میرے باپ کو تاکتے ہوئے بولیں۔

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟ اُس ریاست سے تم ریڈیڈنٹ سے جھگڑا کرنے پر نکالے گئے تھے۔ اس ریاست کے راجہ جی سے تم نے جھگڑا کر لیا۔ انگریزوں سے تم لڑے۔ راجاؤں سے تم نے جھگڑا کر لیا۔ اب ہم جائیں گے کہاں؟ کون ہمیں پناہ دے گا؟"

میرے پتاجی گرج کر بولے "چلتی ہو تو چلو۔ ورنہ تم بھی راجہ جی کے محل میں جا کے بس جاؤ۔ اُنھیں ہمیشہ عورتوں کی ضرورت رہتی ہے"

اتنا کہہ کر پتاجی نے ہمیشہ کے لیے وادی کی طرف سے مُنہ موڑ لیا۔ اور

ڈھکی موڑ کی جانب بڑھنے لگے۔

میری ماں چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح اُٹھیں۔ اُنھوں نے زور سے وادی کی طرف تھوک دیا۔ اور پھر کچھ کہے سُنے بغیر مجھے بازو سے گھسیٹتے ہوئے میرے پتاجی کے پیچھے پیچھے بھاگیں۔

میرے پتاجی آگے آگے چل رہے تھے۔ اور اُن کے پیچھے پتھروں پر لڑکھڑاتی ڈگمگاتی ہوئیں میری ماں جی چل رہی تھیں۔ اور اُن کے پیچھے پیچھے میں روتا ہوا آ رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ ماں جی۔ پتاجی۔ مجھے گھر لے چلو۔ مجھے گھر لے چلو کیونکہ اُن دنوں میں بچہ تھا۔ اور مجھے معلوم نہ تھا کہ جو سچ کے راستے پر چلتے ہیں اُن کے لیے کوئی گھر نہیں ہوتا ہے۔ اور کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی۔ اور کوئی سایہ دار شجر اُن کی راہ میں نہیں ہوتا ہے۔ اور وہ ایک عزم راسخ اپنے سینے میں لیے اس راستے سے گزرتے جاتے ہیں۔ اور اپنے پیچھے یادوں کے چنار چھوڑ جاتے ہیں۔ جو آگ کے شعلوں کی طرح دھرتی سے نکلتے ہیں۔ اور آسمان کی طرف سر بلند ہو کر اُن کی شہادت کی گواہی دیتے ہیں!